Cut


مدیر مسئول
آزاد ہند
حُرِّیت
پیشوا
آرٹ
سیّد عزیز حسن
دہلوی
FIROZE 46

انتساب

میں اپنے مضامین کے اوّلین مجموعہ "صد پارۂ دل" اُردو کے نامور ادیب، ہندوستان کے شہرۂ آفاق سائنس داں، ہندو مسلم اتحاد کے پیکر عمل، مجسمۂ اخلاص و شرافت

ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر

او، بی، ای، جی، ایچ، سی۔ ڈائرکٹر جنرل سائنس اینڈ انڈسٹریل

کے نام نامی و اسم گرامی سے معنون کرتا ہوں۔ جن کے متعلق میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ شاعر کامل ہیں یا انسان کامل۔؟

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

گذرانیدہ

سید عزیز حسن بقائی

ایڈیٹر

حریت، آزاد ہند، پیشوا، آرٹ

جامع مسجد۔ دہلی

یکم جنوری سنہ ۴۵ء

ڈاکٹر سر ایس - ایس بھٹناگر



سردار کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی سحر پی-سی-ایس



جنھوں نے "کتاب صد پارہ دل" کا دیباچہ لکھا

دیباچہ

میرے محترم دوست جناب حافظ سید عزیز حسن صاحب نقشبندی ہندوستان کے مشہور صحافی اور ان "سابقون اولون" میں سے ایک ہیں جنہوں نے دلی میں باقاعدہ بااصول اور خوددارانہ اخبار نویسی کی بنیاد رکھی۔

ان کے قلم میں غیر معمولی زور ہے اور ملکی معاملات میں ان کی بصیرت حیرت انگیز، وہ بیک وقت بہترین انشار پرداز بھی ہیں اور مانے ہوئے اخبار نویس بھی۔ اور یہ دونوں خصوصیات ایک دوسرے سے اتنی متضاد ہیں کہ ان کا جامع بلاشبہ غیر معمولی انسان ہی ہو سکتا ہے۔

سید صاحب دلی کے قدیم باشندے ہیں اور بخاری سید۔ حضرت خواجہ سید رضی الدین صاحبؒ عرف حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ دسویں پشت میں ان کے جد تھے۔ جن کا نسب ۱۲ واسطوں سے شہید کربلا سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام سے ملتا ہے۔

جب دلی میں غدر پڑا اور اشراف گردی شروع ہوئی تو حافظ صاحب کے جد امجد حضرت خواجہ محمد طاہر صاحبؒ، ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد ریاست حیدرآباد تشریف لے گئے۔ جہاں انھوں نے ۱۸۵۸ء میں جناب مولوی سید رحیم الدین صاحب

داروغہ محلات سرکار نظام وجاگیردار سرکار عالی کی اکلوتی صاحبزادی سیدہ حضرت فاطمہ خاتون صاحبہ رحؒ سے شادی کی، جن کی والدہ محترمہ امیر الدولہ امیر الملک نواب محمد یار جنگ بہادر سہ ہزاری منصب دار وجاگیردار سلطان پلی وچیکل سے منسوب تھیں اس طرح سید صاحب کے دادا صاحب دہلی کی جاگیر کے علاوہ اپنی اہلیہ کے انتقال کے بعد حیدر آباد کی جاگیر کے بھی مالک ہوئے۔

سید صاحب کے والد حضرت مولوی خواجہ سید امیر الدین صاحب رحؒ حضرت خواجہ سید محمد طاہر صاحب رحؒ کے منجھلے صاحبزادے تھے جو دہلی تشریف لے آئے اور وطن کی محبت نے پھر یہاں سے نکلنے نہ دیا۔

سید صاحب ہندوستان کے دل، دلّی میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت ۱۱شوال مطابق ۱۱۔ نومبر ۱۸۹۲ء ہے ابھی وہ ہی سال کے تھے کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ یعنے حضرت خواجہ سید امیر الدین صاحب رحؒ کا چوالیس سال کی عمر میں انتقال ہوگیا اور بقائی صاحب اس دنیا میں ـــــ بھری پری دنیا میں ـــــ بے یار و مددگار رہ گئے۔

اگر سید صاحب کے جد امجد حضرت خواجہ سید محمد طاہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ حیدر آباد تشریف نہ لے جاتے اور شادی کر کے وہاں بود و باش اختیار نہ کر لیتے، تو درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سجادہ نشین ہوتے یا اگر بقائی صاحب کے والد محترم حیدر آباد سے دلّی نہ چلے آتے تو سلطان پلی اور چیکل کے جاگیردار ہوتے۔ لیکن مشیّت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ـــــ وہ سید صاحب سے وہ کام لینا چاہتی تھی جو مسند سجادگی پر بیٹھنے سے انجام پاتا۔ نہ ایوان جاگیرداری میں رونق افروز ہونے سے، قضا و قدر کا فیصلہ تھا کہ وہ اخبار نویس بن کر قومی و ملکی معاملات میں حصہ

لیں۔ اس لیئے وہ تمام راستے ان پر بند کر دئے گئے جو انھیں اس منزل پر پہنچنے سے باز رکھ سکتے تھے۔ اور وہ تمام آسائشیں ان پر حرام کر دی گئیں۔ جو انسانی فطرت کو زنگ آلود کر کے اُسے بے عمل بنا دیتی ہیں۔ چنانچہ اس آزمائش کی پہلی منزل یتیمی و بے چارگی تھی۔ جو سید صاحب کو اس طرح پیش آئی جس طرح دنیا کے تمام نامور رہنماؤں کو پیش آئی۔ اور ان میں خود اعتمادی و خود سازی کا جذبہ پیدا کر گئی، جو در حقیقت حیات چند روزہ کی فلاح و کامرانی کا واحد ذریعہ ہے

مولوی خواجہ سید امیر الدین صاحب رح کے انتقال کے بعد سید صاحب کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اُن کی بیوہ ماں پر پڑی۔ چنانچہ عربی اور فارسی کی تعلیم کے لئے انھیں بوریا نشینوں کے سپرد کیا گیا۔ انگریزی تعلیم اس زمانہ میں کم از کم حضرات علماء کے نزدیک شجر ممنوعہ تھی۔ پھر اس کے اخراجات کی کفالت کون کرتا، مجبوراً زمانہ کی اس شدید ضرورت کی تکمیل سے محروم رہے اور علوم مشرقی کی حسب استطاعت تکمیل کے بعد عملی دنیا میں قدم رکھا کہ اس کے بغیر زندگی ایک امر دشوار ہوئی جا رہی تھی۔

سنہ ۱۹۱۲ء سے اخبار نویسی یا صحیح لفظوں میں مضمون نگاری شروع کی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عملی سیاست میں بھی حصہ گیر ہو گئے۔

دنیا کا پرانا اصول ہے کہ جب کوئی شخص ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے تو اُسے ہر قدم پر کانٹے اور جھاڑ بالے ملتے ہیں۔ یہ گویا ایک قسم کی کسوٹی ہوتی ہے۔ جس پر انسان کی عالی حوصلگی اور بلند نظری کے جھوٹے یا سچے ہونے کا اندازہ کیا جاتا ہے جو لوگ محض نمود و نمائش کے لئے یا کسی خام جذبہ کے پیش نظر اس راہ پر آ پڑتے ہیں وہ

ان کانٹوں اور جھاڑیوں سے دل تنگ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں یا واپس ہو جاتے ہیں لیکن جن کے دل ہر قسم کی مادی غرض سے پاک ہوتے ہیں۔ اور جن کی نظر شاید منزل پر ہوتی ہے وہ ان موانع کی مطلق پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ یہ رکاوٹیں ان کے سمند شوق کے حق میں تازیانے کا کام کرتی ہیں۔

سید صاحب نے بھی جب ترقی کی راہ پر قدم رکھا تو یہ کانٹے اور جھاڑیاں اُن کے ہر قدم کے لئے تیار تھیں۔ حاسدوں نے ہر طرف سے ان پر یورش کی۔ اور یہ یورشیں جوں جوں وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ترقی پذیر ہے۔ ان کے خلاف سازشیں ہوئیں۔ حکومت کی نگاہ میں انھیں باغی ثابت کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ان پر جھوٹے مقدمات دائر کرائے گئے۔ انھیں بنگال کی انارکسٹ پارٹی کا ایک رکن بتایا گیا غرض یہ کہ انھیں آگے بڑھنے سے روکنے کے لئے ہر ممکن طریقہ عمل میں لایا گیا۔ لیکن اس دھن کے پکے شیر دل انسان نے اپنی رفتارِ ترقی میں کوئی کمی نہ آنے دی اور برابر آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں سید صاحب اُن "سابقون اوّلون" میں سے ہیں جنہوں نے دلی میں اخبار نویسی کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ چنانچہ انڈین پریس قائم کیا۔ مولینا عارف ہسوی مرحوم اور لالہ شنکر لال کی معیت میں روزنامہ حریت جاری کیا۔ جس میں سید صاحب جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ یہ اخبار کچھ دن جاری رہ کے بند ہو گیا۔

تھوڑے عرصہ بعد خلافت کی تحریک میں سید صاحب کو چھ ماہ کی سزا ہوئی اور

جیل سے واپس آنے کے بعد انھوں نے پھر ملکی معاملات میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں صرف پچیس روپے کے حقیر سرمایہ سے رسالہ پیشوا جاری کیا جوان کی بلند حوصلگی اور خود اعتمادی کی بیّن مثال ہے۔ یہ رسالہ بڑی پر شور منزلوں سے گزرا اور آجتک جاری ہے اور مخالفوں کی ناکام سعی کے باوجود ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں اوقاف اسلامی کے سلسلہ میں اصلاحی کام شروع کیا۔ اسمبلی میں بل پیش کرایا۔ اور اپنے اس کام کو جان دار بنانے کے لئے سنہ ۱۹۳۸ء میں پھر حریت ہفتہ وار جاری کیا۔ جو ابتدائً بہت معمولی حالت میں تھا۔ لیکن اب ایک طاقت ور، اور باثر اخبار ہے۔ حافظ صاحب کی کوششیں بارآور ثابت ہو رہی ہیں۔ اور جس مقصد کے لئے انھوں نے ہفتہ وار حریّت جاری فرمایا تھا وہ قریب الحصول ہوگیا ہے۔

اُردو علم و ادب کی خدمت کے لئے انھوں نے سنہ ۱۹۴۱ء میں اُردو کا ماہوار رسالہ آرٹ جاری کیا جو نہایت کامیابی سے اُردو علم و ادب کی خدمت کر رہا ہے۔

نیز اس کے علاوہ روزنامہ آزاد ہند بھی دو تین سال سے تنہا ایڈٹ کر رہے ہیں جو ہندوستان کے کامیاب اخبارات میں شامل ہے۔

کام کا یہ عالم ہے کہ صبح کے چار بجے سے جو لکھنا شروع کرتے ہیں تو اُن تھوڑے وقفوں کے علاوہ جو دوست احباب سے بات چیت کرنے یا اکل و شرب میں پیش آجاتے ہیں۔ سارے سارے دن تنہا کام کرتے رہتے ہیں۔ کام وہ اس بڑھاپے میں بھی چھ آدمیوں کے برابر کرتے ہیں۔

ان مختلف اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود تقریباً ایک سو کتابیں بھی پیشوا بکڈپو سے شائع فرما چکے ہیں، جن میں دو درجن سے زائد ان کی ذاتی تصانیف ہیں۔ اسی سلسلہ کی جدید کڑی صد پارۂ دل ہے جو اس وقت میرے پیش نظر ہے اور جس پر میں آئندہ سطور میں تبصرہ کروں گا۔

" صد پارۂ دل " مولینا سید عزیز حسن صاحب دہلوی کے مضامین کا مجموعہ ہے جو موصوف کی ۲۲ سالہ حیات اَدبی کا کارنامہ ہے۔ اور جس کو ہم کتابی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ موصوف کی یہ پہلی تصنیف نہیں ہے وہ اس سے پہلے بھی بہت سی کتابیں تصنیف یا تالیف فرما چکے ہیں۔ اور مضامین بھی ان کے قلم سے بے شمار نکل چکے ہیں

اس مجموعہ میں بقائی صاحب نے وہی مضامین شامل کئے ہیں جو بقول خود "کسی نہ کسی نوعیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔"

ویسے موصوف کا لکھا ہوا کون سا مضمون کم اہم ہوتا ہے۔ مگر اس مجموعہ کے مضامین واقعی اپنا جواب آپ ہیں۔

حافظ صاحب نے مذہبی، سیاسی معاشرتی، طنز یہ سب ہی قسم کے مضامین لکھے ہیں۔ مذہبی مضامین میں وہ ایک دیندار واعظ نظر آتے ہیں۔ سیاسی مضامین میں آتش نوا خطیب۔ معاشرتی میں مصلح اور طنزیہ میں نفسیات کے ماہر، ان کا کوئی مضمون اٹھا کر دیکھ لیجئے ہر لفظ میں لکھنے والے کی روح بولتی نظر آئے گی۔ یہی چیز مضمون کی کامیابی و ماہر کی ضامن ہے۔

سب سے پہلے مضمون " التجا " میں آپ بہت سی التجاؤں کے درمیان التجا سننے والے کی بارگاہ میں اپنی قوم کی تاریخ اس طرح [illegible] کرتے ہیں۔

"اے عاجز نواز قدوس! ہندوستان میں دس کروڑ کی آبادی رکھنے والی مسلم قوم کی تباہی کی سازشیں اس طرح ہو رہی ہیں جس طرح اب سے سات سَو سال پہلے اندلس میں ہوئی تھیں۔ پھر کیا تو گوارا کرے گا کہ اتنی بڑی قوم جس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ اس کفر زار میں تیری وحدانیت کی تنہا علمبردار ہے۔ ہندوستان سے مٹا دی جائے"۔

تاریخی مثال کے ساتھ، بندگی کے لہجہ میں اپنی قوم کی تباہی پر اس سے زیادہ دلکش پیرایۂ بیان میں اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

سید صاحب جس طرح بلند اُردو لکھنے پر قادر ہیں۔ اسی طرح وہ بھاشا کی شیریں عبارت لکھنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اور یہ ان کی وہ خصوصیت ہے، جس میں اُن کی انفرادیت کارفرما ہے۔ ایک مضمون "آشا لگی من کی" کے چند جملے ملاحظہ فرمائیے۔

"آشا دو جگ داتا! پریتم پیارے، سندر روپ، پریم مورت شیام سندر، جگ موہن! کہ اس سنسار میں سب ہی نر ناری نراشا ہیں۔ اور اُن کے من کا کلیش، تمہاری اور صرف تمہاری آشا سے دور ہو گا۔"

اسی قسم کا ایک حسین ٹکڑا اور ملاحظہ فرمائیے جو "پی ہو کی بولی بول پپیہے" سے ماخوذ ہے۔

"جس نے غلامی کا نام ونشان مٹا کر پستول کو بلند کیا۔ سامراج کو نیست ونابود کیا، حقیقی مساوات، سچی حریت پیدا کی۔ وُسی پی ہو کی بولی بول پپیہے۔"

حقائق کو اس قدر شیریں اور موہنے انداز میں بیان کرنا بقائی صاحب کا حصہ ہے۔

اسی طرح ان عنوانوں پر غور کیجئے جو اس مجموعہ میں موجود ہیں۔

"جیون نیا ڈگمگ ڈولے!" "نینن جل برسائے سجنی!" "من ہے ڈانواں ڈول ساجن!" ان کے ماتحت جو مضامین لکھے گئے ہیں۔ ان کی زبان نہایت دلکش ہے۔ اور یہ تمام مضامین "نظم منثور" کا بہترین نمونہ ہیں۔

تمام مضامین میں مصنف کی قوت فکر اور بلند تخیل کارفرما نظر آتی ہے، کوئی فقرہ کوئی جملہ ایسا نہیں ہے جس کو بھرتی کا کہا جائے۔ پھر عنوانات اس قدر بولتے ہوئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر ہی قاری پورا مضمون پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نگارش دراصل وہی کامیاب ہے جس کا کوئی سنٹرل آئیڈیا (مرکزی تخیل) ہو۔ یوں ایک صاحب قلم بہت کچھ لکھ سکتا ہے۔ لیکن تحریر میں تضاد یا گنجلک ہو، تو اس سے کوئی افادی پہلو نمایاں نہیں ہو سکتا۔ بقائی صاحب کے ہاں مرکزی تخیل ہر جگہ موجود ہے اُن کی ذہنیت مصلحانہ ہے، اور دل درد مند، وہ جو بات بیان کرنے ہیں، تحریر کرتے ہیں تاثرات میں ڈوب کر تحریر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مضمون ختم کرنے کے بعد انسان چند لمحات کے لئے غور و فکر کی دنیا میں پہنچے بغیر نہیں رہتا۔ موصوف کا لہجہ، جہاں تک اطلاق ہو گیا ہے۔ وہ مضمون ایک زندہ تصویر

کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ایسا ایسکچر جس کو ہم بجبر و اکراہ سننے پر مجبور نہ ہوں بلکہ لیکچرار کا دامن تھام کر اس سے اصرار کر رہے ہوں کہ "خدا کے لئے کہے جایئے"!!

سید صاحب کا ایک مضمون، دوست دشمن کیوں کر بنتے ہیں، بڑا حقیقت افروز ہے۔ اس میں ایک جگہ آپ لکھتے ہیں۔

"مسرت و الم اور حظ و کرب یہ ایسے الفاظ ہیں کہ جس وقت انسان پر ان کی حالت طاری ہو جاتی ہے تو وہ بالکل عریاں ہو کر سامنے آجاتا ہے"

موصوف کا تخیل جہاں تعمیری ہے وہاں شاعرانہ گداز سے بھی نہیں اپنے ایک مضمون "عورت دنیا میں کیوں آئی۔؟" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"کسی بڑے سے بڑے ایوان عیش کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک عورت کا ہاتھ اس بزم آرائش میں شامل نہ ہو۔ کہ یہی اس کی تخلیق کا منشا ہے اور فطرت اور نیچر کی خواہش بھی یہی ہے۔ کاروبار عالم میں دیکھیں یہ کارگاہ عالم تو نہ تھا) اس کو دنیا کے بلند ترین مقام پر دیکھئے"

عورت کے موضوع پر بقائی صاحب نے جتنے مضمون لکھے ہیں وہ اُن کی انشائے عالیہ کا بہترین نمونہ ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب عورت کی فطرت کے سب سے بڑے راز دار ہیں۔ مثال

کے طور پر اسی مضمون ــــ "عورت دنیا میں کیوں آئی؟" کا ایک حسین ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے۔

"عورت اپنے شانے سے کبھی آنچل خود نہیں گراتی، مگر جب آنچل گر جاتا ہے تو سینہ کا جائزہ لے کر دل ہی دل میں خوش ہوتی ہے دہرائے ہوئے آنچل میں سینہ کا اُبھار غائب کرنا منظور نہیں"

آگے لکھتے ہیں :۔

"عورت ہزار پارسا ہو، لیکن وہ محرم کے جائزہ نظری کو حسن کی صحیح داد سمجھتی ہے اور جوانی کی زیبائشوں میں چھپے ہوئے قیدیوں کو جو "عورت کے اَرمانِ مجسم" ہیں دیکھنا پسند کرتی ہے"

کس قدر لطیف اور شاعرانہ اندازِ بیان ہے کہ سَر دُھننے کو جی چاہتا ہے ایک اور ٹکڑا سن لیجئے۔

"عورت اگر کبھی محرم کے بند کھینچ کر باندھے تو سمجھ لیجئے کہ آج قیامت برپا ہو کر رہے گی اور کوئی خوش نصیب زد پر ضرور آئے گا"

میر ناصر علی مرحوم کے انتقال کے بعد سید صاحب کے علاوہ اور کسی ادیب کی تحریر میں اس موضوع پر اتنی دلکش اور پتہ کی باتیں دیکھنے میں نہیں آئیں اب اس موضوع پر میں سید صاحب کی تحریر کا ایک آخری ٹکڑا اور پیش کروں گا جس میں عورت کی نفسیات کا اتنا گہرا مشاہدہ ہے کہ انسان پڑھ کر وجد

کرنے لگتا ہے۔ "عورت کیا ہے"، کے آخر حصہ میں فرماتے ہیں۔

"تجربے سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ عورت جتنی زیادہ اخلاقی حیثیت سے گرتی جاتی ہے، اتنی ہی زیادہ اپنے تئیں معصوم بھی سمجھتی ہے۔ اور وہ اپنی عفت مآبی کے تذکرے ان لوگوں کے سامنے زیادہ دلیری سے جرأت کے ساتھ بیان کرتی ہے، جو اسکی عصمت کا بارہا سودا کر چکے ہیں۔

آخری جملے کی واقعیت کا کوئی ٹھکانہ ہے۔

طنز نگاری اصناف ادب میں سب سے اہم اور سب سے مشکل صنف ہے اس کے لئے وافر علم، وسیع مطالعہ۔ اور گہرے مشاہدہ کی ضرورت ہے کوئی ادیب طنز نگار نہیں ہوسکتا۔ جبتک کائنات کے مختلف پہلوؤں پر اچھی طرح غور نہ کرے زندگی کے گوناگوں مظاہرہ کو اپنی دماغی کاوشوں کا مرکز نہ بنائے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے سے اچھا ادیب جب طنز نگاری کی وادی پرخار میں قدم رکھتا ہے تو اس کا اشہب قلم جگہ جگہ ٹھٹک کر رہ جاتا ہے اور اگر چلتا ہے تو ٹھوکریں کھاکھا کر۔ سید صاحب چونکہ پرانے اخبار نویس ہیں ملکی سیاست کے علاوہ بین الاقوامی معاملات پر بھی ان کی نظر ہے۔ وہ اس ماحول میں پلے بڑھے ہیں۔ جسے صحیح معنوں میں علمی ماحول کہا جا سکتا تھا۔ انھوں نے ان بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں جو مجسم علم اور سراپا اخلاق تھے۔ اور اس زمانہ میں ہوش سنبھالا ہے۔ جب معمولی لکھا پڑھا بھی آج کل کے ڈگری یافتہ لوگوں سے زیادہ معلومات رکھتا تھا۔ اس لئے جب کبھی وہ طنز نگاری کی طرف آتے ہیں تو ان کے قلم سے ایسے فقرے گل بوٹوں کی طرح کھلنے لگتے ہیں نظر

مست ہو جاتی ہے اور وجدان رقص کرنے لگتا ہے دل ان کی نشریت سے بےچین ہو جاتا ہے اور دماغ ان کی معنویت میں کھو جاتا ہے۔ اس مجموعہ میں بھی طنزیات سے متعلق چند مضامین ہیں۔ جن میں سب سے پہلا مضمون "نانی اماں" ہے۔ جس میں طنز نگاری کے علاوہ کردار نگاری کے بھی اچھے نمونے ہیں۔ پس منظر میں دلی کی وہ پرانی تہذیب ہے جو اب ایسی مٹی ہے کہ اس کے دوبارہ زندہ ہونے کی کوئی امید بظاہر نظر نہیں آتی اور جسے دلی والے شاید ہمیشہ کے لئے روتے رہیں گے نانی اماں کا سراپا سید صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔

"عمر ایک سو بیس سال کی۔ سانولا رنگ چھوٹی چھوٹی گول مگر چیپر زدہ آنکھیں جو اندر دھنس کر تقریباً غائب ہو گئی ہیں۔ پپوٹے لٹک کر آنکھوں کیلئے چلمن بن گئے ہیں۔ منہ میں ایک دانت بھی نہیں اس لئے منہ ہمیشہ کھلا ہی رہتا ہے زبان دانتوں کی تبیسی نہ ہونے سے اکثر باہر نکلی رہتی ہے اسی کی وجہ سے خاصی کالی کلکتہ والی معلوم ہوتی ہیں۔ چہرہ پر جھریاں اس غضب کی پڑی ہوئی ہیں کہ بچڑی ہوئی دھوتی معلوم ہوتی ہے۔ ناک لونگ چڑے کی والے کی پھلکی معلوم ہوتی ہے۔"

تشبیہ کی ندرت وجدت ملاحظہ ہو۔

"جب نانی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر چلتی ہیں تو چلتی پھرتی رٹی ٹیبل معلوم ہوتی ہیں۔" ——— ایک اور ٹکڑا دیکھئے۔

"نانی اماں جب بیٹھتی ہیں تو گردن کے لئے گھٹنے اسٹینڈ کا کام دیتے ہیں اور جس وقت گھٹنے کانوں سے معانقہ کرتے ہیں اور نانی اماں کی گردن گھٹنوں کے بیچ میں سے نکلتی ہے، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھتنی ہے، جو موری

میں سے جھانک رہی ہے۔"
تشبیہ کی "لطافت" سے قطع نظریہ ملاحظہ فرمایئے کہ تصویر کشی کس بلا کی ہے! نانی اماں کی عمر گو ایک سو بیس سال کی ہے، مگر جوانی کی امنگیں دل میں ابھی تک باقی ہیں جو دلیل ہیں اس بات کی کہ زندگی کا سارا سرمایہ اور عمر کا بہترین حصہ ختم ہو جانے پر بھی نانی اماں کو سکون دل کی دولت حاصل ہے وہ دولت جو متمدن زندگی کے اس پر آشوب دور میں عنقا ہو کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ دیکھئے۔

"سفید بالوں میں مہندی کا خضاب ہے جس سے نانی خاصی سرخاب کی مادہ معلوم ہوتی ہیں آنکھوں میں دنبالہ دار کاجل لگا ہوا ہے جسنے آنکھوں میں پانی آنے کے بعد نانی اماں کو خاصا بیچاپا بنا دیا ہے۔

ذرا نانی اماں کے گہنے پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

"کانوں میں پتے اور بالیاں ہیں۔ گلے میں چمپاکلی اور ٹیپ ہے بازوؤں پر جوشن ہیں ہاتھوں میں چوہے دتیاں اور پہونچیاں ہیں اور پیروں میں جھانجن ہیں۔" ——— لباس دیکھئے!

"سرخ مخمل کی وصلی کی جوتی۔ جوری دار سیاہ گورنٹ کا پائجامہ۔ بابل لیٹ کا مدانی کے کام کا کرتہ۔ سرخ جارجٹ کے دوپٹہ پر زردوزی بوٹیاں کنارے پر پٹھے کی گوٹ۔"

اب بناؤ سنگھار کی باری ہے۔

"منہ میں پن کٹے سے کٹا ہوا پان۔ چو باچھوں سے بہکر ٹھوڑی تک آگیا ہے کنگھی چوٹی تک سے ٹنک۔ پٹیاں جمی ہوئیں۔ غرضکہ نانی اماں اسوقت

خاصی بیر بہوٹی معلوم ہوتی ہیں"

اس کے بعد نانی اماں کی افتاد مزاج اور مرغوبات کا بیان ہے۔ بچوں کے انھیں چھیڑنے کی تصویر ہے۔ بڑوں کے ان سے مذاق کرنے کی کہانی ہے۔ اتنی شیریں زبان اور اتنے لطیف اسلوب میں کہ دل بیقرار ہو ہو جاتا ہے، دوسرا مضمون "ایڈیٹر کی زندگی کا ایک دن" ہے جو نہ صرف یہ کہ طنزیات کا اچھا اور بہت اچھا نمونہ ہے۔ بلکہ پوری کتاب کی جان ہے، اس مضمون میں سید صاحب نے ایک ۳۵ سالہ ایڈیٹر کی ایک روزہ زندگی کا خاکہ کھینچا ہے۔ اور چونکہ وہ خود ایڈیٹر ہیں اور انھوں نے ان منزلوں کا مشاہدہ ہی نہیں تجربہ بھی کیا ہے اسلئے اس کا ایک ایک لفظ حقیقت و صداقت کا ایک دفتر ہے ایک ایک حرف اصلیت اور واقعیت کا ایک مخزن ہے، دماغی کام کی کثرت ایڈیٹر کیلئے معمولی بات ہے، وہ غریب نہیں جانتا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو دماغ سے کام لینا نہیں جانتے۔ گویا قدرت نے انھیں دماغ دیکر ان پر ظلم کیا ہے اس بیچارہ کو دماغ سے اتنا کام لینا پڑتا ہے اور اس کا دماغ ہر وقت اس قدر مصروف رہتا ہے۔ گویا معدہ کی بجائے دماغ ہی غذا ہضم کرتا ہے۔ جگر کی بجائے دماغ ہی میں اخلاط کی تولید ہوتی ہے۔ دل کی بجائے دماغ ہی دھڑکتا ہے آنکھوں کے بجائے دماغ ہی دیکھتا ہے۔ اور کانوں کی بجائے دماغ ہی سنتا ہے دماغ کی ان کاوشوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ اسکی زندگی دماغ ہی کے دائرے میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ اپنی صحت "دماغ دیوتا" کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ ———— ایڈیٹر کی اس بیچارگی کا اظہار حافظ صاحب نے بڑے اچھے پیرایہ میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"چہرہ کتابی ہے۔ جبیں جوانی میں بڑھاپا ٹپک رہا ہے۔ یہ موٹے تازے تو نہیں ہیں مگر توند ضرور آگے نکلی ہوئی ہے۔ گلے پچکے ہوئے ہیں۔ ماتھا بالوں

کی سرحد سے خالی ہے، چہرہ زرد ہے آنکھیں چھوٹی چھوٹی عینک سے ڈھکی ہوئی ہیں ناک ستواں ہے۔ جس پر عینک کی کمانی کا نشان ہے۔ تیوری چڑھی ہوئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کسی سوچ میں ہیں یا غصہ میں۔ مگر ان کی تیوری کے بل سے غصہ کا گمان نہ کیجئے۔ یہ غصہ میں نہیں ہیں بلکہ صورت ہی کچھ ایسی ہو گئی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ صاحب خدائی فوجدار ہیں دنیا جہاں کی اچھائی برائی کے چوکیدار ہیں "

صحافتی زندگی کی مصروفیت ایڈیٹر کی معاشرتی زندگی کو کس حد تک برباد کر دیتی ہے یہ دلخراش حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"یوں تو ایڈیٹر صاحب تمام دنیا کی خوشیوں اور رنجوں میں شریک ہیں لیکن چراغ تلے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ کیونکہ خود اپنے اور گھر اور کنبہ کی خوشیوں اور اپنوں میں اُن کیلئے کوئی حصہ نہیں رہا ہے یہ تو جاگنے سے سونے تک اخباروں اور رسالوں کیساتھ روتے یا ہنستے رہتے ہیں "

اس کے بعد ایڈیٹر کی دوسری مصیبتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں ڈاک اور ملاقاتیوں کی مصیبت اس غریب کیلئے ایک مستقل آزار ہیں۔ جنسے چھٹکارا مرتے دم تک تو ہوتا نہیں۔ دوسری زندگی میں ہو جائے تو ہو جائے!" —— طوالت کے خوف سے ہم دوسرے مضامین پر تفصیلی تبصرہ نہیں کر سکتے۔ "طوائف" اور "ایکٹرس" اس باب کے خاص مضمون ہیں۔

ادیب ہو یا ایڈیٹر، شاعر ہو یا مصور، اگر وہ صحیح معنے میں فن کار ہے تو اس کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ وہ مذہبی رواداری کا علمبردار ہو گا۔ ذہنی تعصبات اور فرقہ وارانہ نزاعات

کے لئے اس کے مشرب میں کوئی گنجائش نہیں وہ مومن وکافر کے ان مادی امتیازات سے ہمیشہ بلند رہتا ہے، جنہوں نے دنیا میں امن وسلامتی کے بجائے، ہمیشہ جنگ جدال کو دعوت دی ہے حضرت مرزا غالب نے کہا ہے۔

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

حضرت غالبؔ کا یہ شعر، ہر اس فن کار کی زندگی کا آئینہ ہے جو فکر وتصور کی انتہائی بلندیوں میں سانس لیتا ہے، جس کی ساری کوششیں دنیا کو رشک ومنافست کا جہنم نہیں بلکہ محبت و اخوت کی جنت بنانے میں صرف ہوتی ہیں۔ سید صاحب بھی اسی گروہ کے ایک فرد ہیں مذہبًا وہ مسلمان ہیں اور عقیدۃً سنی۔ لیکن جس محبت وعقیدت کے ساتھ انھوں نے "ال عبا" کے بزرگوں کا ذکر کیا ہے، وہ ان کے مذہبی تعصب سے بالا ہونے کی بین دلیل ہے۔ وہ اگر ایک طرف پیغمبر اسلام صلعم اور ان کے محبوب دوستوں کا ذکر نہایت احترام سے کرتے ہیں تو دوسری طرف گوتمؑ، مسیحؑ، کرشن، رامؑ، باباگرونانکؒ اور دوسرے مصلحین کا تذکرہ بھی بڑی محبت اور تکریم سے کرتے ہیں اور یہی ان کی فن کارانہ بلندیوں اور عظمتوں کا بہترین ثبوت ہے۔

اب میں آپ حضرات سے رخصت چاہتا ہوں۔ یہ آخری کلمے کہہ کر کہ سید صاحب کے مشاق قلم نے کوئی سنجیدہ اہم اور ضروری موضوع نہیں چھوڑا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ نسلیں ان سے پورا پورا استفادہ کریں گے۔

لذت برد، از دل گذرد ہر کہ ز پیشم
من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

صد پارۂ دل

سید عزیز حسن
ایڈیٹر حریت و پیشوا
کے
۳۲ سالہ مضامین نگاری کے شہ پارے

پبلشرز
آرٹ بک ڈپو
دہلی

بار اول — قیمت عـہ/

ملنے کا پتہ: منیجر رسالہ پیشوا — جامع مسجد — اردو بازار دہلی

فہرست مضامین "صد پارۂ دل"

خدا اور رسولِ خدا کی حضور میں نیاز

الہامات

غیر مسلم اقوام کے مذہبی رہنما

تلمیحات (مزاحیہ)

سید عزیز حسن دہلوی



۱۹۱۸ء میں

سید عزیز حسن دہلوی



۱۹۳۰ء میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید!

میری مضمون نویسی

میں نے مضمون نویسی سنہ ۱۲ء میں شروع کر دی تھی۔ اُس وقت میں فرضی ناموں کشاف رعد وغیرہ سے دہلی لاہور، [illegible] کے اخبارات و رسائل میں لکھا کرتا تھا۔

میں نے جن اخبارات و رسائل میں مضامین لکھے ہیں، اُن کے نام جو مجھے یاد رہ گئے یہ ہیں:

(۱) رفیق	روزانہ	دہلی
(۲) نئی روشنی	"	الہ آباد
(۳) زمیندار	"	لاہور
(۴) سیاست	"	لاہور
(۵) الصباح	"	دہلی
(۶) جمہور	"	کلکتہ

(۷) دہلی گزٹ	روزانہ	دہلی
(۸) نظام المشائخ	ماہوار	دہلی
(۹) غریبوں کا اخبار	ہفتہ وار	دہلی
(۱۰) ہمدم	روزانہ	لکھنو
(۱۱) گروسیوک	ماہوار	دہلی
(۱۲) صبح امید	ہفتہ وار	دہلی
(۱۳) الجمعیۃ	ہفتہ وار	دہلی
(۱۴) پارس	ہفتہ وار	دہلی
(۱۵) خطیب	ہفتہ وار	دہلی
(۱۶) ہمدرد	روزانہ	دہلی
(۱۷) پیشوا	ماہوار	دہلی
(۱۸) حریت	ہفتہ وار	دہلی
(۱۹) مسلمان	ہفتہ وار	دہلی
(۲۰) الامان	سہ روزہ	دہلی
(۲۱) پیغام	روزانہ	دہلی
(۲۲) قوم	ہفتہ وار	دہلی
(۲۳) رعیت	روزانہ	دہلی
(۲۴) وکیل	ہفت روزہ	امرتسر
(۲۵) اشتراکی	ماہوار	دہلی

(۲۶)	حریت	روزانہ	دہلی
(۲۷)	سوز و ساز	ماہوار	دہلی
(۲۸)	فتح	روزانہ	دہلی
(۲۹)	کانگریس	روزانہ	دہلی
(۳۰)	درویش	پندرہ روزہ	دہلی
(۳۱)	مولوی	ماہانہ	دہلی
(۳۲)	آرٹ	ماہانہ	دہلی

اس کے علاوہ درجنوں اخبارات و رسائل ہیں جن میں میرے مضامین شائع ہوئے۔ لیکن میرے دماغ میں ان کے نام محفوظ نہ رہے۔ اور متعدد انگریزی اخبارات (ہندوستان ٹائمز، بمبئی کرانیکل۔ ہریجن وغیرہ) ایسے اخبارات ہیں جنھوں نے میرے مضامین کا ترجمہ شائع کیا۔ میں ان مضامین کے کٹنگ حفاظت سے رکھ سکا جو میری پرشور سیاسی زندگی میں لکھے گئے تھے۔

اب ان اخبارات کی فہرست ملاحظہ ہو۔ جن کے ایڈیٹر اور رکن تھے اور مضامین زیادہ تر میرے لکھے ہوئے تھے۔

(۱) صبح امید

(۲) غریبوں کا اخبار

(۳) گرو ہیوک

سب سے پہلے جس رسالہ پر میرا نام بطور ایڈیٹر شائع ہوا وہ دہلی کا ایک ماہانہ صوفیانہ رسالہ (گرو ہیوک) تھا۔

۲۵ء میں ایک ماہوار مذہبی رسالہ (پیشوا) اپنا ذاتی جاری کیا۔ اور اس میں بحیثیت ایڈیٹر انچارج میرا نام شائع ہوا۔ لیکن دوسرے اخبارات و رسائل میں مضامین نویسی کا سلسلہ جاری رہا۔

بہت سے فرضی ناموں سے میں نے پیشوا میں مضامین لکھے ہیں۔ تاکہ قارئین پیشوا ایک نام کے مضامین سے گھبرا نہ جائیں۔ اور اب مجھے یاد بھی نہیں رہا کہ میں نے کن کن ناموں سے مضامین لکھے ہیں۔ اس لئے وہ ذخیرہ بھی غیر محفوظ ہی سمجھا جائے گا۔

کیونکہ مجھے خیال بھی نہ تھا کہ کسی روز میرے مضامین کا مجموعہ شائع ہوگا۔ اس لئے زندگی کے بڑے حصہ کے مضامین ضائع ہی سمجھنے چاہئیں۔

یہ صد پارۂ دل کا پہلا حصہ ہے، جو بہت جلدی میں مرتب کرکے اس کلیہ کے ماتحت شائع کیا جا رہا ہے "نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے"۔ ورنہ مضامین میرے حسب منشا مرتب نہ ہو سکے۔ اور نام کی موزونیت کے اعتبار سے بھی پورے سو نہیں ہیں۔ تاہم اس اطمینان پر اس کو شائع کر رہا ہوں کہ دوسرے ایڈیشن میں یہ کمی پوری ہو جائے گی۔

میں نے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۴۴ء تک جو کچھ لکھا ہے اس کو اگر جمع کیا جائے تو میرے وزن سے زائد اخبارات و رسائل کا وزن ہوگا۔ لیکن نہ سب مضامین جمع ہو سکتے ہیں اور نہ سب اس ایک مجموعہ میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں کہ ۱۲ء سے ۲۵ء تک کے مضامین میں سے کوئی ایک مضمون بھی محفوظ نہیں اور ۲۵ء سے ۴۴ء

تک حریت، پیشوا۔ آرٹ میں اکثر تنوع پیدا کرنے کے لئے فرضی ناموں سے جو کچھ لکھا اُس کے متعلق بھی یاد نہیں کہ کونسا مضمون میرا ہے۔ میں لختِ دل کے سو ٹکڑے اگر ایک جگہ جمع نہ کرسکوں تو کیا قابلِ سرزنش ہوں؟ اگر شمار کیا جائے تو میں نے پچیس ہزار سے زائد صفحات لکھے ہونگے اور دولاکھ سے زیادہ صفحات پڑھے ہوں گے۔ اس لئے یہ مجموعہ مضامین کسی صورت میں بھی میرے تمام مضامین کا جو تاریخ۔ مذہب۔ سیاست ادب۔ مزاح۔ اصلاح پر لکھے گئے ہیں انتخاب نہیں کہا جاسکتا۔

نیز اس کے بعد اُن افسانوں کا نمبر ہے جو میں نے لکھے ہیں جن کی تعداد کسی حالت میں بھی دوسو سے کم نہیں ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ بھی لکھا جا رہا ہے۔ اور بہت جلد آرٹ بک ڈپو کی طرف سے شائع ہوگا۔

اب ان تصانیف کی فہرست ملاحظہ ہو جو اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں۔ یا مسودہ کی صورت میں محفوظ ہیں۔

(۱) حسینؑ
(۲) زینب کبریٰؓ
(۳) باورچی خانہ
(۴) بچّی کی استانی
(۵) گھر والی کی تربیت
(۶) تعلیم خانہ داری۔

(۷) سیرت باقیؒ
(۸) عام فہم قاعدہ
(۹) تاریخ اسلام
(۱۰) تاریخ ہند
(۱۱) اسلام کے سورما سپاہی
(۱۲) درس معاشرت
(۱۳) غزنویؒ
(۱۴) محبوب الٰہیؒ
(۱۵) غوریؒ
(۱۶) خواجہ غریب نوازؒ
(۱۷) خواجہ کاکیؒ
(۱۸) مجدّد الف ثانیؒ
(۱۹) بارہ امامؑ
(۲۰) آلِ رسولؐ
(۲۱) سیدہ خاتونِ جنتؓ
(۲۲) نامورانِ اسلام
(۲۳) مشاہیرِ اسلام
(۲۴) پنجتن پاکؑ
(۲۵) ابدالیؒ

اس انتخاب میں وہی مضامین لئے گئے ہیں جو کسی نہ کسی نوعیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر اردو لٹریچر کے قدردانوں نے اس انتخاب کو پسند کیا تو دوسرے ایڈیشن میں وہ تمام خامیاں پوری کر دی جائیںگی جو اس میں ہیں۔ اور ترتیب بھی اس سے بہتر ہوگی۔

ایک وقت تھا کہ میں اٹھارہ گھنٹے کام کیا کرتا تھا۔ لیکن اب بڑھاپا ہے۔ بیماریوں نے مستقل طور سے میرے جسم میں چھاونیاں ڈال دی ہیں۔ پچپن سال کی عمر ہے۔ اس لئے وہ مستعدی اور جوش تو نہیں رہ سکتا۔ لیکن اب بھی میں اکیلا دو کاپی نویسوں کو مضمون دے سکتا ہوں۔ اور جب کوئی زود نویس محرر لکھنے کے لئے مل جاتا ہے۔ تو میں اتنی تیزی سے لکھواتا ہوں کہ زبان کا ساتھ محرر کی انگلیاں نہیں دے سکتیں۔ اگر یہ سہولت مجھے جوانی میں حاصل ہوتی تو میں یقیناً دو محرروں کو بھی مضمون لکھوا سکتا۔

اگر مجھے کوئی اسسٹنٹ مل جاتا جو کتابوں میں نشان لگا کر میرے لئے رکھ سکتا تو میری تصانیف بہت زیادہ ہوتیں۔ لیکن افسوس ہے کہ دو تین حضرات پر محنت کی۔ کام کا آدمی بنانے پر روپیہ، وقت خرچ کیا۔ مگر جب وہ اس قابل ہوئے کہ ان کے کام پر اعتماد کیا جا سکے، انھوں نے انتہائی غداری کی۔ نمک حرامی کی۔ اور اپنے غیر شریفانہ کردار سے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ایسے محسن کشوں اور نمک حراموں کا مزید تجربہ نہ کروں۔ ورنہ ظاہر ہے

کہ اردو لٹریچر میں اس سے زیادہ مفید اضافہ ہوتا۔

اب صورت یہ ہے کہ میں اگرچہ چار بجے کام شروع کر دیتا ہوں، لیکن بہت جلد تھک جاتا ہوں۔ پھر اس پر مصیبت یہ ہے کہ کام کے لئے چونکہ کوئی علیحدہ جگہ نہیں ہے، اس لئے ملاقاتیوں کی یورش اور ہر شخص کا آکر کاغذات کی تلاشی لینا اور نہایت بے رحمی اور غیر ذمہ داری سے کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر نا میرے لئے انتہائی مصیبت اور تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے جس یکسوئی کی ضرورت ہے وہ مجھے حاصل نہیں۔ اور جب تک ہندوستان کے باشندوں کو فضول ملاقاتوں۔ بے کار در شنوں کا شوق ہے اور میرے لئے کسی بہتر مکان کا بند و بست نہ ہو، ان لعنتوں سے نجات ملنی ناممکن ہے۔

اگر یہ صورت نہ ہوتی تو بھی مضامین اور تصانیف کی کثرت ہوتی۔ تاہم جو کچھ ہے وہ غنیمت ہے۔

اس ایڈیشن کے ختم ہونے، حالات کے بہتر ہونے پر انشاء اللہ دوسرا ایڈیشن شائع ہوگا تو اس وقت تمام خامیاں دُور ہو جائیں گی۔

افسوس ہے کہ نام کی موزونیت کے لحاظ سے سَو مضامین نہیں ہو سکے۔ اور ان طنزیہ مضامین کو روکنا پڑا جو بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود بعض دوست نہیں چاہتے کہ اس حصہ میں اُن کو شائع کیا جائے۔

اگرچہ جس وقت کتاب کو مرتب کیا گیا تھا اُس وقت ان مضامین کو شامل کتاب کرنا ضروری تھا۔ لیکن آخری وقت یہ ارادہ ملتوی کردیا گیا۔

توقع ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں بہت سے نئے مضامین شامل ہوں گے۔ اس وقت تو جو کچھ ممکن ہوسکا، ترتیب اور موزونیت کا خیال کئے بغیر پیش خدمت ہے۔

ممکن ہے میرے بعد میرے مضامین کو صحیح طور سے ایڈٹ کیا جائے۔

شکریہ

سب سے پہلے مجھے اُس قادر ذوالجلال کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جس نے اپنے فضل ذرّہ نواز سے میری تحریرات کو مقبولیت عطا فرمائی۔ اور مجھے صراطِ مستقیم پر رہنے کی بصیرت بخشی۔ اور مجھ ضعیف و ناتواں کو یہ جرأت و ہمت عطا فرمائی کہ وہ کثرت و قلت سے بے پروا ہو کر بلا خوف لومت لائم وہ کہے جو قدرت کہوانا چاہتی ہے۔

کیونکہ نفع کو نقصان میں تبدیل کرنے۔ ہر دلعزیزی کو ٹھکرانے کی توفیق اسی نے مرحمت فرمائی ہے جس نے ان پڑھ کہوارہ فطرت میں علم و عمل سے بے بہرہ ہونے کے باوجود تعلیم دی اور اندھیرے سے اُجالے کی طرف رہنمائی کی ہے۔

اس کے بعد ان بزرگوں اور دوستوں کا ممنون ہوں جنھوں نے "صد پارۂ دل" پر اپنے پاکیزہ خیالات ظاہر کئے۔ جنکو پڑھ کر میں شرمندہ ہونیکے ساتھ حمد کا سجدہ ادا کرتا ہوں جس نے بڑے بڑے ذی علموں کے مقابلہ میں مجھے کامیاب زندگی بخش کر میرے حاسد پیدا کئے۔

اگر میرے کاروبار کی ترقی سے حسد کرنے والے میری کامیابی سے سبق لیکر اتنی ہی محنت کریں جتنی میں کرتا ہوں۔ اور اسی حق پسندی اور جرأت کا اظہار کریں تو حسد کی ناکامی کی بجائے کامیابی اُن کے قدم چومے۔ اور اس بے نتیجہ بیماری سے خداوند قدوس اُن کو شفا بخشے۔

عزیز حسن

سید عزیز حسن دہلوی



۱۹۴۶ء میں

عرضِ نیاز

زینغ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

التجا

اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لَنَا بِالْخَیْرِ وَاخْتِمْ اُمُوْرَنَا بِالْخَیْرِ

(۱)

راعی اور رعایا کے خدا، ظالم و مظلوم کے منصف، محکوموں اور مظلوموں کے درد اور دُکھ کی بپتا سننے والے مجیب الدعوات، پیشوا کا آغاز تیرے مقدس اور تسکین بخش نام کے ساتھ کرتا ہوں۔

گورے اور کالے، حاکم اور محکوم، غلام اور آقا، فرمانبردار اور نافرمان، کافر اور مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، یہودی اور مجوسی، فاسق و فاجر، عابد و زاہد، متقی اور عصیاں شعار کو اپنی آغوشِ رحمت میں لینے والے غفور الرحیم، آج جبکہ غلامی اور مظلومی کے ساتھ نفاق اور افتراق خود بینی اور خود پرستی نے اُمّتِ مسلمہ کے پیشواؤں کو گھیر لیا ہے تو اسے لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین

کا حکم دینے والے جگ داتا، اپنے ایک ذلیل اور ناکارہ بندہ کو عزم و استقلال صبر و رضا، بے خوفی اور اطمینان قلب کی لازوال دولت سے مالا مال کردے، کہ وہ دنیا سے منھ موڑ کر اور دنیا کے طاقتور انسانوں سے بے پروا ہو کر، یثرب کے دھنی کے بتائے راستے پر چلنے کے لئے اُمّتِ مُسلمہ کو پکارے۔

اے آسمان اور زمین کے خالق، اے بحر و بر اور خشک و تر کے مالک فاران کی چوٹیوں پر جلوہ دکھانے والے نور، رات کی تاریکی اور تنہائی کے سناٹے میں نظر آنے والے مولا، سمندروں کی روانی اور پہاڑوں کی بلندی پر اپنی بادشاہت کو تسلیم کرانے والے شہنشاہ، زلزلہ اور بارش کے طوفان میں جھلک دکھانے والے آقا، آدمؑ کو خلافت کا فخر بخشنے والے مولا، خلیلؑ کو نمرودی جہنّم کو گلزار بنانے والے قادر مطلق، نوحؑ کی فریاد سن کر اُن کی کشتی کو طوفان کی ہلاکت باریوں سے محفوظ رکھنے والے عاجز نواز قدوس، ایوبؑ کو صبر کی لازوال دولت عطا کرنے والے مولیٰ، یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکالنے والے رب توانا، ذکریاؑ کو آرہ سے چروا کر امتحانِ عشق میں ثابت قدم رکھنے والے پاک بے نیاز، مریمؑ کے بطن سے اپنی نشانی ظاہر کرنے والے یفعل اللہ ما یشاء و یختار، عیسیٰؑ کو صلیب کی لعنت سے بچانے والے قادر و توانا، بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم و ستم سے بچانے والے رؤف الرحیم فرعون کو نیل کی آغوشِ فنا میں پہونچانے والے جبّار۔ کرشن کی بنسری میں سمانے والے پرم آتما، راکشش کنس کے ظالمانہ تخت و تاج کو اُلٹ دینے والے جگدیش۔ گوتم بدھ کو راہِ ہدایت دکھانے والے بھگوان، رام کو بن باس کی

کڑی منزل میں ثابت قدم رکھنے والے جوتی سروپ، یوسفؑ کی چاہ کنعاں میں حفاظت کرنے اور زلیخا کے مکر سے محفوظ رکھنے والے بھگوان۔ ناکام و نامراد ہستیوں کو دمن رحمۃ اللہ کا فرمان کا تسکین بخش پیغام دینے والے آقا اور اے وہ کہ تیرا آستانۂ قدس بے کسوں اور بے نواؤں کی آخری جائے پناہ ہے۔ آج وہ تیرا بھاگا ہوا غلام جس کے ماتھے پر اطاعت و فرمانبرداری کا کوئی نشان نہیں، تیرے در پہ صرف ندامت کے پسینہ میں ڈوبی ہوئی پیشانی چشمِ خوں بار، اور پرسوز قلب لے کر اس امید پر حاضر ہوا ہے کہ اس نیلگوں اور وسیع آسمان کے نیچے تیرے سوا کون ہے جو اس کے دل کی شکستگی کو جوڑے اور اس کی درد بھری آواز کو سنے اور اس کے مضطرب اور بے چین قلب کو تسکین دے؟ پھر اس زمین پر تیری بارگاہ عزت و جلال چھوڑ کر تو ہی بتا کہ وہ کہاں جائے؟

رب کعبہ! وہ ارضِ پاک جس کو تو نے بلد آمنا کے خطاب سے مخاطب کر کے اس کے امن کی قسم کھائی تھی۔ آج اس میں تیرے بے کس اور لاچار اور مظلوم بندوں کے لئے امن نہیں رہا۔ اسی ارضِ مقدس میں نہتے مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر خاک و خون میں تڑپایا جا رہا ہے —— جس مقدس سرزمین کے جانوروں کو بھی ایذا دینے کی ممانعت تھی، وہاں تیرے برگزیدہ بندے بندوں کی ہڈیاں بھی محفوظ نہیں اور آہ کہ تیری پرستش گاہیں منہدم کی جا رہی ہیں۔

اے ارض حجاز کو حرمت و عظمت کا فخر عطا کرنے والے قدوس جس خاک پاک کی عزّت و حرمت پر مرمٹنا ہر مسلم ہستی کا مقصدِ حیات تھا، آج اُس کی

قادسیت مسلمانوں کی بد اعمالی کی وجہ سے خطرہ میں ہے۔ اور اگر تیری نگاہ کرم اِنپر نہ پڑی تو عالم بدبہن سُنی اور صفا کی مقدس وادیاں صلیب پرستوں کے بُوٹوں کی جولانگاہ بن جائیں گی اور پھر اے پاک بے نیاز تو ہی بتا کہ کیا تو اس کے لئے تیار ہے؟

خداوندا! ان سیاہ کاروں کو فنا کردے۔ جو تیرے محبوب بندوں کے آرام میں مخل ہوں۔ اور جنھوں نے تیری پرستش گاہیں منہدم کردیں۔ کہ یہ گستاخ اس امانت کے اہل نہیں۔

بار الہا! ان روسیاہوں کو غارت کر جنھوں نے ارضِ پاک پر غیر مسلم تسلط قبول کیا۔ اور صلیب پرستوں کے ہاتھ جزیرۃ العرب کی آزادی بیچ ڈالی اور ہزارہا عازمانِ حجاز اور صدہا بے گناہ ترکوں کا خون اُن کی گردن پر ہے کہ وہ اپنی نفس پرستی اور ہوسِ بادشاہی کے سبب اس ارضِ محترم میں رہنے کے قابل نہیں۔

الہ العالمین! فرانس اور ہسپانیہ کے کفاروں نے تمام انسانی اور اخلاقی قوانین کو پس پشت ڈال کر شام و رلیف میں تیرے نام لیواؤں پر ایسے ہولناک مظالم کئے ہیں کہ اُن کے سُننے سے کلیجہ شق ہوا جاتا ہے۔ اور انسانیت نوحہ خواں ہوتی ہے۔ اور یہ مریم پرست ایسے بربرانہ مظالم صرف اس لئے روا رکھتے ہیں کہ وہ خدائے واحد کے پرستار ہیں۔ پھر کیا تیری رحمت جوش میں نہ آئے گی؟ اور تیری مخفی نصرت فرمائیاں اور تیرا غیبی ہاتھ اسلام کے ان غیور مجاہدین کی طرف نہ بڑھے گا؟ جو صرف تیرے نام کی سربلندی کے لئے اپنے

خون کو پانی کی طرح شام کے مرغزاروں اور افریقہ کے ریگ زاروں میں بہا رہے ہیں۔

غریبوں اور کمزوروں کے آقا! حاکمانہ اقتدار اور شاہانہ غرور اب اس درجہ ترقی کر گیا ہے کہ تیری کمزور اور غریب مخلوق اس کو برداشت نہیں کر سکتی۔ الٰہی ان میں قوت برداشت اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے والی پُرامن طاقت عطا فرما۔

عاجز نواز قدوس! ہندوستان میں دس کروڑ کی آبادی رکھنے والی مسلم قوم کی تباہی کی سازشیں اس طرح ہو رہی ہیں جس طرح اب سے سات سو سال پہلے اندلس میں ہوئی تھیں۔ پھر کیا تُو یہ گوارا کرے گا کہ اتنی بڑی قوم جس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ اس کفر نواز زمین پر تیری وحدانیت کی تنہا علمبردار ہے ہندوستان سے مٹا دی جائے؟

زیردستوں کو زبردست بنانے والے مولا! ہندوستان کے سیاسی اور مذہبی پیشواؤں کی آنکھوں سے غفلت کا پردہ ہٹا، کہ وہ بھی آنے والے خونی انقلاب کے بادلوں کو دیکھ لیں۔ اور مسلمانوں کی بربادی اور سوراج اور نام نہاد ہندو مسلم اتحاد سے پہلے تنظیم اسلامیہ کی ضرورت و اہمیت انکے پیشِ نظر ہو۔

اے ابراہیمؑ و محمدؐ کو برکت عطا کرنے والے خدا! دنیا سے تیری محبوب صداقت کا نام مٹنے والا ہے۔ وہ سچائی جو رسولوں اور پیغامبروں، اوتاروں اور رشیوں اور اولیاء کرام کے ذریعہ دُنیا میں پھیلائی گئی تھی اب مظلوم ہو گئی ہے۔

بار الہا! پیغمبر آخر الزماں کی پیشین گوئی کے مطابق بلد امین میں حضرت امام مہدیؑ کو جلد ظاہر فرما کہ دنیا اب ضلالت و گمراہی میں گھر گئی ہے۔ اور حاکمانہ گھمنڈ ــ محکومانہ مظلومی انتہا کو پہنچ گئی ہے اور تیرے بیکس بندوں پر تمدن و تہذیب کے نام سے وہ ظلم ہو رہا ہے جس کے تخیل سے انسانی روح کانپ اُٹھتی ہے۔ خداوندا! غیرتِ الہٰی کب جوش میں آئے گی؟

ادعونی استجب لکم کی بشارت دینے والے بے نیاز! اور امن یجیب المضطر اذا دعاہ و یکشف السوء کی نوید روح پرور سے ہمتوں کو بلند کرنے والے آقا! ہماری ان کوششوں میں برکت دے، جو پیشوا کے ذریعے ہم اُمت مسلمہ کی بہتری کے لئے کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہم کو ایسا عزم واستقلال عطا فرما کہ جس کو سمندر کی قہار موجیں اور پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیاں ہلانے سے عاجز ہوں ــــ ہماری زبان میں بطفیل ابراہیمؑ و محمدؐ ایک طوفانی جوش پیدا کر کے عزم و استقلال اور صداقت و سچائی اور ایمان لازوال کی طاقت سے ہمارے دست و بازو کو ایسا قوی کر کہ ہم باطل کی کسی طاقت سے مرعوب نہ ہوں۔ اور ظلم و جبر، خوف و دہشت کا کوئی جھونکا ہم کو صراطِ مستقیم سے نہ ڈگمگائے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملتہ علی الذین من قبلنا۔ ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ۔ واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم الکفرین ــــ

مولیٰ! میری سُن!

(۲)

عابدِ شب بیدار کے خدا! زاہد تقویٰ شعار کے خدا، ظالم و مظلوم کے خدا، نافرمانوں اور فرمانبرداروں کے خدا، فاسق و فاجر کے خدا، ہندو و مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، یہودی سب کے خدا، اور اے رب العالمین، شہ رگ سے زیادہ قریب ہو کر نظر نہ آنے والے وجود، میری سُن!

آدمؑ کو خلیفہ بنانے والے خدا، خلیلؑ کو نمرودی جہنم سے نجات دینے والے خدا، نوحؑ کی کشتی کو طوفان کی ہلاکتوں سے بچانے والے داتا، ایوبؑ کو صبر کی لازوال دولت سے مالامال کرنے والے مولا، یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکالنے والے قدوس، زکریاؑ کو آرہ سے چروانے والے پاک بے نیاز، مریمؑ کے پیٹ سے اپنی نشانی ظاہر کرنے والے آقا، عیسیٰؑ کو صلیب کی لعنت سے بچانے والے محبوب، موسیٰؑ کو فرعون پر فتح دینے والے مطلوب میری سُن۔

فاران کی چوٹیوں پر جلوہ دکھانے والے نور، کرشن کی بانسری میں سمانے والے پرم آتما، کنس کے ظالمانہ تخت و تاج کو اُلٹ دینے والے پربھو، رام کو بن باس کی کڑی منزل میں ثابت قدم رکھنے والے بھگوان، گوتم بدھ کے ہادی رحمٰن۔ یوسفؑ کو زلیخا کے جال سے نکالنے والے آقا میری سُن۔ رات کی تاریکی میں نظر آنے والے مولیٰ! سمندروں کی سطح میں جلوہ دکھانے

والے خدا، پہاڑوں اور آسمانوں پر حکومت کرنے والے شہنشاہ، زلزلہ اور بارش کے طوفان میں جلوہ دکھانے والے سبحان، مایوس و مضطرب ناکام و نامراد ہستیوں کو تسکین و تسلی کا پیام دینے والے رحیم میری سُن!

صدقہ آدمؑ کے برسوں بہنے والے آنسوؤں کا۔ صدقہ سینکڑوں سال تیری راہ میں نوحؑ کے پتھر کھانے کا۔ صدقہ تیری اطاعت میں جلنے اور ذبح ہونے کے لئے تیار رہنے والے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کا، صدقہ موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا جو تیرا پیام لے کر دنیا میں آئے۔ میری سُن۔

صدقہ آمنہؓ کے لال کا۔ جو شب چراغ تھا، صدقہ اس درِ یتیم کا جس پر تمام دنیا کے مسلمانوں کے ماں باپ قربان ہیں۔ صدقہ اس شہنشاہ یثرب و بطحیٰ کا جس کے لمبے بالوں کو واللّیل اذا یغشیٰ سے تشبیہہ دی گئی، صدقہ اس مجسمۂ صبر و حلم کا جس نے طائف میں تیرا پیام توحید سُنانے کے جرم میں پتھر کھائے اور اُف نہ کی۔ صدقہ عزم و استقلال کے اُس کوہ وقار کا جس نے احد کے میدانِ جنگ میں باوجود دشمنوں میں تنہا گھر جانے کے قدم پیچھے نہ ہٹایا۔ صدقہ دنیا کے اس بہترین فیلڈ مارشل کا جس نے بدر کے معرکے میں دشمنوں کی زیادتی کا دل میں خوف لائے بغیر کامیاب مقابلہ کیا، صدقہ حِرا کے اس چاند کا جو محض اُمت کو بخشوانے کے لئے ساری ساری رات عبادت میں مصروف رہا۔ صدقہ اس دین و دنیا کے مالک کا جس نے کبھی پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا۔ صدقہ اُس کا جس کو تو نے یاایھا المزمل اور یاایھا المدثر سے خطاب فرمایا۔ صدقہ اس مقدس

ومحترم لہو کا جو کارزار احد میں اس محترم وجود کا بہا جس کا سایہ نہ تھا، صدقہ اس گیسوؤں والے کا جس کے سبب سے کُن کا ظہور ہوا، صدقہ اس کا جس نے تیری راہ میں پیٹ پر پتھر باندھ کر جہاد کئے۔ صدقہ اس کا جس کی شان میں لولاک لما خلقت الافلاک ہے۔ صدقہ اس کا جس کے ہاتھ کو تو نے اپنا ہاتھ کہا، صدقہ اُس کا جس کو دنیا کے لئے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا، میری سُن!

صدقہ کربلا کے اس بہتے ہوئے مے۔ ان کا جس میں آلِ محمدؐ نے تیرے دین کی حفاظت کے لئے بہتر تنوں سے لاکھوں اشقیاء کے ظلم کا مقابلہ کیا اور حق کی حمایت میں جان دے کر اسلام کی آبرو رکھ لی۔ صدقہ علی اصغرؑ کے اس ننھے اور معصوم حلق کا جو یزیدی افواج کے تیرِ ستم کا نشانہ بنا۔ صدقہ علی اکبرؑ کی اس جوانی کا جس کی بہار شمرؔ کے سپاہیوں نے نہ دیکھنے دی۔ صدقہ شہربانوؑ کے اس صبر و ضبط کا جو کربلا کے میدان میں اُن سے ظاہر ہوا۔ صدقہ اس تسلیم و رضا کا جو خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ عابدؑ بیمار سے ظاہر ہوا، صدقہ امام مظلوم کے اس جسم سے بہنے والے مقدس خون کا جو سجدہ کی حالت میں شمرؔ کے خنجر سے بہا، میری سُن!

صدقہ اس محبت کا جو سرورِ کائناتؐ کو حمیراؓ سے تھی۔ صدقہ اس محبت کا جو نبی کریمؐ کو گیسو دراز شہزادوں حسنؑ و حسینؑ سے تھی۔ صدقہ بلالؓ کے اس خلوص کا جو اُن کو حضورِ انورؐ سے تھا۔ صدقہ اویسؓ کی اس نیازمندی کا جو اُن کو تاجدارِ مدینہ سے تھی۔ صدقہ اس تسلیم و رضا کا جو فاطمہؓ کے لال

حسنؓ سے زہر کھانے میں ظاہر ہوا۔ صدقہ خالدؓ کی اس تلوار کا جس نے روم و ایران کی سلطنتوں کو پاش پاش کیا۔ صدقہ حمزہؓ و عباسؓ کا جن کی خارہ اشگاف تلواریں دشمنانِ اسلام کا خون بہانے میں بہت بیباک تھیں۔ صدقہ خاتونِ جنت کے ان ہاتھوں کا، جن میں چکی پیسنے سے نیل پڑ جاتے تھے۔ صدقہ علیؓ کا جن کو رسول اللہؐ کی سب سے زیادہ لاڈلی بیٹی بیاہی گئیں۔ اور جو رسول اللہؐ کے بعد روحانیت کے سب سے بڑے تاجدار تھے۔ صدقہ اس محترم ہستی کا جس نے سب سے پہلے تیرے محبوب کی رسالت کی تصدیق کی اور جو تمام دنیا کے مسلمانوں کی سب سے پہلی ماں تھیں، صدقہ عثمانؓ کا جنکے روپے نے اسلام کی آڑے وقت مدد کی اور جن سے رسول اللہؐ کی دو صاحبزادیاں منسوب ہوئیں۔ صدقہ عمرؓ کی اس دلیری کا جس کی وجہ سے اسلام کا پیغام سب سے پہلے وادیٔ غیر ذی ذرع میں آزادی کے ساتھ سنا گیا اور جن کی چاہیتی بیٹی حضورؐ انور کی ازدواج میں تھیں صدقہ صدیق اکبرؓ کا جو آنحضرتؐ کے سچے عاشق اور سب سے پہلے رفیق تھے اور جنکی صاحبزادی کو آپ پیار سے حمیرا کہتے تھے، میری سُن!

اُونٹ اور بکریاں چرانے والوں کو بادشاہ بنانیوالے شہنشاہ! میں تیری وسیع بادشاہت میں سے زمین کا کوئی ٹکڑا حکومت کے لئے نہیں مانگتا کہ میرا دل انسانوں پر حکومت کرنیوالوں کے مظالم دیکھکر لرز رہا ہے۔ مجھے تیرے لاتعداد خزانوں میں سے زر و جواہر کی خواہش نہیں کہ میرے آقا و مولیٰ غریبوں کو پسند کرتے تھے اور زر کی خواہشوں میں دُنیا کے کتنے جلیل القدر انسان سازشیں تیرے نام پر کرتے ہیں اُنسے جی اُکتا گیا ہے۔ نبوّت و رسالت کو ختم کر دینے والے داتا میرا ظرف اس قابل نہیں ہے

کہ کسی بڑی امانت کا خواستگار ہوں۔ میں تو تیرے لاتعداد اور اَن گنت اختیارات

تسکینِ قلب کا خزانہ

(۳)

دنیا والوں کی مادہ پرست آنکھوں کے سامنے جب چاروں طرف نا امیدی اور یاس کے گھٹا ٹوپ بادل چھا جاتے ہیں اور جب ناکامی اور نامرادی کی بھیانک صورتیں سامنے آ کر ان کے کلیجے ہلا دیتی ہیں تو وہ گھبرا کر اپنے گرد و پیش نظر ڈالتی ہیں کہ شاید کوئی مادی سہارا نظر آ جائے، ظاہر اور محسوس چیزوں پر اعتقاد رکھنے والے دل جب حسرت نصیبی اور تیرہ بختی کے متلاطم سمندر میں ڈوبنے لگتے ہیں تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف نگاہیں ڈالتے ہیں کہ شاید کوئی تنکا سہارے کے لئے مل جائے۔ مادی قوتوں کا قائل اور روحانیت سے متنفر انسان جب مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کا دماغ اور اُسکے خدا بجلی اور بھاپ اُسے ان بلاؤں سے نجات دلانے میں عاجز رہتے ہیں، تو وہ اس عالمِ یاس و حرماں میں کبھی جن چیزوں کو ڈھونڈھتا ہے وہ یا تو روپیہ ہیں، یا ہوائی جہاز اور مشین گنیں۔ لیکن اسی مادی دنیا میں اور اسی محسوس آب و گِل کے عالم میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں اور اکثر آئے ہیں کہ جب زر و جواہر ٹھیکریوں اور سنگ ریزوں سے بھی کم وقعت ثابت ہوتے ہیں اور بھاپ بجلی اور ڈائنامیٹ ایک آہ سرد، ایک تبسم نکردہ اور ایک بانگ بے ہنگام سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ جنگل بیابان کے اندر جہاں نہ انسانی

آبادی ہو نہ بازار، ایک بھوکے پیاسے آدمی کی ضرورت نہ سیم وزر کے انباروں سے رفع ہوسکتی ہے نہ گُہرہائے آبدار سے، اور ایک مایوس العلاج مریض کے کرب میں تسکین نہ دخانی جہازوں سے پیدا ہوسکتی ہے نہ لاسلکی پیغامات سے۔ کامل نااُمیدی کی حالت میں کہ جب مرکر چھٹکارا پانے کی بھی اُمید نہ رہے ایک پیغام ہے، اور نہ صرف ایک پیغام ہے جو لاسلکی کے ذریعے سے نہیں بلکہ جبریلِ امین کی معرفت خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ نے اپنے سچے پیغامبر کے پاس پہنچایا تھا۔ آج تیرہ سو برس گزر گئے لیکن اس پیغام کی اثرانگیزی میں کوئی فرق نہ پڑا اور تیرہ لاکھ برس گزرجانے پر بھی اس کی تاثیر فرسودہ اور پُرانی نہ ہوگی۔ مادی قوتوں کے بجائے اگر انسان تمام مختلف قوتوں کے سرچشمہ پر بھروسہ رکھے اور لا تقنطوا من رحمۃ اللّٰہ پر اس کا سچا اعتقاد ہو تو مایوسی اور حسرت نصیبی اس کے قریب بھی نہیں آسکتی وہ مادی قوتوں سے مدد لینے والا نہیں بلکہ اُن پر حکومت کرنے والا بن سکتا ہے جس سے اس کو تسکینِ قلب کا خزانہ حاصل ہوسکتا

(پیشوا جنوری ۱۹۲۷ء)

سلام بحضور خیر الانام

(۴)

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

سلام اُن پر جن کے مولود مسعود کی بشارت حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسٰیؑ اور سری کرشن اور دیگر تمام رسولوں، پیغامبروں، رشیوں اور اوتاروں نے دی۔

سلام اُن پر جن کی ولادت باسعادت کی خبر تمام الہامی اور آسمانی کتابوں میں تھی۔ اور جن کی ولادت کے وقت قصرِ کسریٰ کے کنگورے لرز گئے تھے۔

سلام اُن پر جو پیدا ہونے سے پہلے یتیم تھے اور ہوش و خرد سنبھالنے سے قبل دُرِّ یتیم ہو گئے۔

سلام اُن پر جنھوں نے بچپن میں بکریاں چرائیں اور جن کا سینہ مبارک چاک کر کے نُور سے معمور کیا گیا۔

سلام عبد المطلب کے نور العین کو، سلام ابو طالب کے لختِ جگر کو سلام آمنہ کے لال کو جو شب چراغ تھا، اور جس کی نورانی شعاعوں نے بُت پرستی کے ظلمت کدوں میں روشنی پہونچائی۔

سلام اُن پر جن کے گھونگریالے بالوں کو وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی

کہا گیا اور سلام اُن پر جن کو یَا ایّھا المزّمل اور یا ایھا المدثر سے مخاطب فرمایا گیا۔

سلام اُن پر جن کو دُنیا کے لئے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا اور جنکو لولاک لما خلقت الافلاک کا درجہ عطا فرما کر سربلند کیا گیا۔

سلام اُس مقدس آفتابِ ہدایت کو جو غارِ حرا سے طلوع ہوا اور جس کی روشنی سے عرب و عجم کی تاریکی دُور ہوئی۔

سلام اُن پر جنھوں نے ادائگی فریضۂ تبلیغ کے جرم میں طائف میں پتّھر کھائے۔ اور تنِ نازنین سے لہو بہنے کے بعد بھی اللھم اھد قومی انھم لا یعلمون کہہ کر اس قطعۂ زمین کو آسمانی عذاب سے محفوظ رکھا۔

سلام اُس فخر الاوّلین والآخرین پر جو پیامِ توحید پہونچانے کی وجہ سے شعب ابی طالب میں محصور رہا اور اُف نہ کی۔

سلام اُن پر جن کو سبحٰن الّذی اسریٰ لعبدہٖ سے سرفراز فرما کر اُن کے علوِ مرتبت کا اعلان کیا گیا۔

سلام اُن پر جن کو دعوتِ حق پرستی کے جرم بے جرمی میں آدھی رات کی تاریکی میں دشمنوں کی ننگی تلواروں کے حصار میں سے نکل کر ہجرت کرنی پڑی اور جن کو وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ کا مژدۂ شرف عطا ہوا۔

سلام غارِ میں ایک شب بسر کرنے والے اُس محترم مسافر پر جس کا رفیق دشمنوں کی غار پر موجودگی سے خائف ہوا تو اُس نے لا تحزن ان اللہ

معنا کہہ کر خدائے قادر و توانا پر بھروسہ کرنے اور ہر مصیبت میں اس سے رجوع کرنے کی بے مثال عملی تعلیم دی۔

سلام اُن پر جو دنیا کے بہترین فیلڈ مارشل تھے۔ اور جن کے نقشے کبھی غلط نہیں ہوئے ۔ جنھوں نے رن بھومی میں آگے قدم بڑھا کر کبھی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور جو ایسے سپنا پتی تھے کہ اپنی فوج کے ادنیٰ سپاہیوں کے ساتھ خندق کھودتے، پہرہ دیتے، ۔ جو خود کھاتے وہی اپنی فوج کو کھلا کر حریت و مساوات کا عملی درس دیتے۔

سلام ان پر جنھوں نے کبھی لڑائی میں سبقت نہیں کی، جو انتہا درجہ کے حلیم تھے۔ مگر زیادتی اور پیش قدمی کرنے والوں کا پوری طرح مقابلہ کر کے ان کو کافی سزا دیتے تھے۔ اور زیادتی کرنے سے منع کرتے تھے۔

سلام عزم و استقلال کے اس کوہ وقار کو جو احد کے میدان کار زار میں ہجوم اعدا میں گھر جانے کے بعد احد کی چٹان سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا ہوا دادِ شجاعت دے رہا تھا۔

سلام ان پر جنھوں نے فتح مکّہ کے روز اپنے اشد ترین دشمنوں کو لا تثریب علیکم الیوم کہہ کر دنیا کے سامنے رحم و رافت کا ایک بے نظیر نمونہ پیش کیا۔

سلام اُن پر جنھوں نے غیر مذاہب کے بزرگوں اور عبادت گاہوں کی عزت کا حکم دیا۔ اور جنھوں نے حالت جنگ میں بھی غیر مُسلم قوموں کے بڈھوں بچوں اور عورتوں کے قتل اور دشمنوں کی کھیتیاں برباد کرنے سے منع فرمایا۔

سلام اُن پر جنھوں نے عہد کی پابندی کا حکم دیا، اور جو مزدور کو فوراً مزدوری ادا کرتے تھے، اور عورتوں — بچّوں پر بہت مہربان تھے۔ — جنھوں نے دُنیا کو پہلی مرتبہ جنسِ لطیف کی عزت سے آشنا کیا، اور جو یتیموں کے والی، غلاموں کے مولیٰ اور بے کسوں کے دستگیر تھے — جو ہر قوم کے بیماروں کی عیادت کے لئے بنفس نفیس تشریف لے جاتے تھے۔

سلام ان پر جو جوانی کی اُمنگوں اور شباب کی پرجوش خواہشوں کے زمانہ میں شرم و حیا کا پیکرِ عمل تھے۔ — جن کی نگاہ کبھی غیر محرم پر نہیں پڑی — جن کو کبھی برہنہ جسم کسی نے نہیں دیکھا۔ اور جنھوں نے کبھی کسی نشہ کی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ — جنھوں نے جُوئے اور نشہ سے اپنی امت کو سختی سے منع کیا۔

سلام اُن پر جن کی زندگی بے حد سادہ تھی اور جنھوں نے کبھی فضول خرچی نہیں کی — جنھوں نے برادری کی ناک کی خاطر کبھی قرض نہیں لیا کہ اُن کو دُنیا کی جھوٹی اور فانی دھوم دھام سے سخت نفرت تھی۔

سلام اُن پر جن کو غیبت، فحش گوئی — سخت کلامی اور کاہلی — بے کاری سے نفرت تھی، اور جنھوں نے کبھی ہٹے کٹے محنت مزدوری کے قابل مسلمانوں کو خیرات نہیں دی اور سب مسلمانوں کو کبھی منع فرمایا اور جن کو جھوٹ سے بے حد

نفرت تھی۔

سلام اُس محترم بوریا نشین کملی والے شہنشاہ کو جس کے غلاموں نے روم و ایران کی زبردست سلطنتوں کو زیر و زبر کرکے عَلَمِ توحید نصب کیا۔

سلام اس نورِ مجسّم کو جو ساری ساری رات عبادت میں گزارتا تھا۔ مگر رہبانوں کی طرح تارکِ دنیا نہ تھا — جس نے دُنیا کے وسیع ملکوں کو تسخیر کیا۔ مگر بادشاہوں کی مانند حکومت نہ کی کہ وہ تو دلوں پر حکومت کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

سلام اُس تاجدارِ عرب و عجم کو، جس کے گھر میں بوقت وصال جلانے کے لئے تیل اور کھانے کے لئے جَو نہ تھے۔

سلام اے مولا! سلام اے سرور! سلام اے غلاموں کو آزادی کا شرف عطا کرنے والے سلام!

سلام اے مکّہ کے تاجدار! سلام اے مدینہ کے شہریار! سلام اے دین و دنیا کے فاتحِ اکبر، سلام اے دنیا کے ہادیِ اعظم، سلام اے اونٹ چرانے والوں کو شہنشاہ بنانے والے سلام۔

سلام اے بابا سلام، اے دانا سلام، اے آقا سلام۔

سلام اُن پر جن پر اسّی کروڑ مسلمان درود اور سلام بھیجتے ہیں۔ اور جن پر پہاڑوں کی ان گنت چوٹیاں اور جنگلوں کے درخت، اور درختوں کے برگ و بار، اور ریگستان کے بے شمار

ذرے ، اور آسمان کے لاتعداد فرشتے درود اور سلام پڑھتے ہیں۔ اور جن پر خود خدائے بے نیاز سلام بھیجتا ہے کہ وہ باعث ایجادِ کُل اور حیات النبیؐ ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ
یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

(رسالہ پیشوا بابتہ ستمبر ۳۶ء)

پرنام

(۵)

پرنام اُن کو جو باعثِ ایجادِ کُل تھے، پرنام اُن کو جو دُعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحؑ کا ظہور تھے ۔۔۔ جن کی آمد کی بنسری گوکل والے کرشن نے بجائی اور جنھوں نے گوتم کے شریر میں پرگھوٹ کیا ۔۔۔ جن کی لیلا، رام نے رچائی اور جو فاطر السموات والارض کے مظہرِ کامل تھے۔ پرنام اُن کو جو سارے سنسار کے لئے کلنکی اوتار تھے۔ اور جن کو شمبل دیپ میں کُل عالم کا اندھیرا دور کرنے کے لئے محمدؐ روپ دھارن کرنا پڑا۔ کہ اُن کا ظہور دُنیا کے لئے شانتی کا پیغام تھا۔

پرنام عرب دیس کے اُس راج کمار کو جس کے فدائی اس سمہ سارے سنسار میں اسّی کروڑ بتائے جاتے ہیں۔ اور جو آج اس امن کے شہنشاہ کی تعلیم کو بھلا کر اغیار کی چوکھٹ کی طرف جھک رہے ہیں۔

پرنام اس سندر ساجن، سندر رُوپ حسینِ کامل مظہرِ الٰہی، پرمچھ پرم آتما کو جو جوانی کی پُر اُمنگ راتیں حرا کے تاریک ترین غار میں بسر کرتا تھا۔ اور جس کے مقدس پاؤں کثرتِ عبادت سے ورم کر آتے تھے۔ اس کے شدید ترین دشمن بھی اُس کو امین اور مقدس راست گو تسلیم کرتے ہیں۔

پرنام اس جمال روپی کو جس پر کائنات کا حُسن نثار ہوتا تھا۔ جس کے رُخِ زیبا میں خالقِ کائنات خود اپنا جلوہ دیکھتا تھا اور جس کے لازوال مقدس حُسن پر عرب و عجم کی وہ حسین ترین عورتیں فریفتہ تھیں۔ جن کی صنف کو جانوروں سے بدتر سمجھکر پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ جن کا اپنے ماں باپ اور خاوند کی جائداد میں کوئی حصہ نہ تھا اور ہندوستان میں خاوند کے ساتھ ستی ہونا بھی اُنکے فرائض میں شامل تھا۔

پرنام اس پوتر جیون پریم مورت شکتی سروپ پرشوتم مہا بلوان کو جس کی پریم لیلا سننے اور اس کے سند رمکٹ کے درشن کرنے کے اس سمے سارے سنسار میں سب ہی نرناری ابھلاشی ہیں۔

موہن مورت، جگت جوتی، نور العالم، آسمانوں کی بلندی، سورج کی تجلی، چاند کی ٹھنڈک۔ کہکشاں کی جگمگاہٹ، پہاڑوں کی عظمت، دریاؤں کی روانی نسیم سحری کے خوشگوار جھونکے سب ہی میں تم ہو اور سب میں تمہارا جلوہ ہے۔ کہ اکاش بانی نے تم کو ہزمّل اور مدثّر کا خطاب دیا۔ اور تمہاری زُلفِ دوتا کو واللیل سے تشبیہہ دی، اور وما رمیت اذ رمیت کا شرف تمہارے علاوہ کسی کو نہ بخشا۔

اس پرتم پیارے کو پرنام آتمک بل اور بُدھی کی کان والے کو پرنام، سمپورن شکتی مہا پرش کو پرنام۔ رواداری اور محبت کے دیوتا کو پرنام۔ جگت موہن تپسوئی کو پرنام، جٹا دھاری فاتح سنسار کو پرنام جس کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، جس کا بائیکاٹ کیا گیا۔ جس شترجون مارنے کے

واسطے محاصرہ کیا گیا۔ جس کو اپنے پرچو کا سندیسہ دینے کے جرم میں اس کے پیارے دیس سے جلا وطن کیا گیا۔ اور جب وہ اپنے پیارے وطن میں فاتحانہ داخل ہوا۔ اس کے تمام سفاک دشمن اس کے آگے مجرمانہ حیثیت سے پیش کئے گئے تو اُس نے لا تثریب علیکم الیوم کا آزادی بخش نعرہ لگا کر عفو و رحم کے نورانی تخت پر جلوہ افروز ہو کر دنیا کو محوِ حیرت بنا دیا۔

چندرماں سے بڑھ کر سندر اور دے ہو کر میرا پرنام قبول کرو جبکی تمام اُمیدوں کا آخری سہارا تمہاری اور صرف تمہاری ذات ہے۔ آج سمہ میرے ہردے کو تمہارے درشنوں کی چناؤنی ہے۔ اور جس کی ادستھا ہے۔ کہ وہ تمہارے پاؤں دبائے۔ اور تمہارے سر کو تیل لگائے اور تمہارے تلووں سے آنکھیں ملے اور تمہاری خاک پاک کو سرمۂ چشم بنائے کہ اسکی نجات کا راستہ یہی ہے۔

سچائی اور امن کا پیغام لانے والے اس جمیلِ مطلق کے جمال روپی کو پرنام، جو بے کسوں کا چارہ ساز تھا، غریبوں کا ملجا تھا۔ یتیموں کا والی تھا۔ ضعیفوں کا بوجھ بازار سے اُٹھا کر اُن کے گھر پہنچا دیتا تھا اور بیواؤں کے گھر کے کام کرتا تھا۔

پرنام اس عارفِ کامل، اس شافع محشر، اس ساقیِ کوثر، اس رحم مجسّم یثرب باسی، عزم و استقلال کے کوہ وقار کو جو ایک طرف میدانِ جنگ میں دشمنوں کے مقابل صف آرا ہے۔ دوسری جانب برہ کی ماری

خدیجہ کے ساتھ کاشانۂ نبوت میں جلوہ فرما ہے اور پھر دنیا نے اس شہسوار کو رات کے سنّاٹے میں مصروفِ عبادت بھی دیکھا۔

پرنام اس نرگسی آنکھ والے ساجن کو جس کی مست آنکھ پر کائنات صدقہ ہو رہی تھی ـــــ جو نُور کے بادلوں میں بُلایا گیا اور جس پر فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ کے راز کا انکشاف ہوا۔

پرنام اس میٹھے بول بولنے والے پریتم پیارے کو جس کے دشمن اُس کے قدموں پر گر کر اُس کے میٹھے بولوں کی وجہ سے اس کے سب سے بڑے جاں نثار ہو کر مرے اور آج اس سمہ سارے سنسار میں اس سچائی کے میٹھے بول بولنے والے سجنا کے گیت گائے جا رہے ہیں۔

پرنام دنیا کے اس بہترین سیناپتی کو جس کا ثانی دنیا آج تک پیدا نہ کر سکی۔ اور جو ایسے اُمّی فیلڈ مارشل تھے کہ جن کے نقشے کبھی غلط ثابت نہیں ہوئے۔ جنھوں نے ہمیشہ اپنی سینا کے ساتھ خندقیں کھودیں۔ پہرے دیئے اور اپنی طرزِ عمل سے حاکم و محکوم کے فرق و مراتب کا خاتمہ کر دیا۔

پرنام اُس آفتابِ ہدایت کو جو غارِ حرا سے طلوع ہوا اور جس کو لولاک لما خلقت الافلاک کا ملبوس و برتر درجہ دیا گیا۔

پرنام اُن کو جو من کی اشانتی دُور کرنے اور دُنیا کو کلیش اور کلفت سے نجات دلانے آئے تھے۔ اور جن کی مسکراہٹ پر کائنات رقص کرتی تھی، اور جن کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہوا۔

پرنام اُن کو جنھوں نے بکریاں چرا کر شہنشاہی کی اور جو خاتونِ جنّتؑ کے باپ تھے۔ اور جو زلفوں والے حسنؑ حسینؑ کے نانا تھے۔ جنھوں نے بڑے بڑے فرزانوں کو اپنی زُلفِ دوتا کا دیوانہ بنا رکھا تھا۔

پرنام اُن کو جنھوں نے کبھی پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا اور جن کو تمام عمر کبھی نرم بستر پر استراحت فرمانے کا موقع نہ ملا۔— جو تمام مذاہب کے مریضوں کی عیادت کے لئے پیدل جایا کرتے تھے — جو رحم کے اوتار تھے اور — ایسے برزخِ کبریٰ تھے کہ دنیا والوں کو رشد و ہدایت فرمانے کے باوجود کبھی ناپاک دنیا سے ملوث نہ ہوئے۔ اور جن کے کاشانے میں شبِ وفات روشنی کا بھی سامان نہ تھا۔ اور جو اُمّت کے ایسے رفیق تھے کہ پیدا ہوتے ہی اُمّت کی بخشش کے لئے لبِ جاں بخش سے دعا مانگی اور رفیقِ اعلیٰ کے پاس جاتے وقت بھی اُمّت کو فراموش نہ کیا۔ اور جو قیامت کے روز بھی اُمّتی اُمّتی کا نعرہ لگائیں گے — جن کی تعلیم کو بدبخت اُمّت نے اِس دورِ بادیت

والحاد میں کھلا دیا ہے۔

اُن کو پرنام اور اُن کی نگری کو نمسکار، جس کی دید کی تمنا میری آخری آرزو ہے۔

صَلّٰوا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیمًا

میلاد نامہ اخبار حریت مارچ سنہ ۳۴ء)

درشن دو

(۶)

درشن دو، اے باعث ایجاد کل، درشن دو اے دعائے خلیلؑ اور نوید مسیحاؑ که تمہارے آنے کی خوش خبری مہا تما گوتم بدھ اور سری کرشن اور سری رام چندر نے دی تھی۔

درشن دو بھاگ داتا، من داتا، جگدیش روپ، ست رُوپ جگت موہن، شیام سُندر، پوتر جیون، پریم مورت، شکتی سروپ، مہا بلوان کہ آج (۱۲ ربیع الاول) دنیا کے سب ہی نر ناری تمہاری پوتر کتھا سنکر تمہارے سندر مکٹ کے درشن کرنے کے ابھلاشی ہیں۔

درشن دو اے شمبل دیپ (عرب) میں جنم لینے والے کلنکی اوتار کہ تمہارے پوتر جنم — تمہاری پاک لیلا — تمہاری مقدس کتھا کے بعد تمہارے چالیس کروڑ غلام تمہارے درشنوں کے لئے مضطرب اور بیچین ہیں۔

درشن دو اپنی چکور کو اے مدنی چاند، درشن دو اے آمنہ کے لال۔ اے وشنو داس (عبد اللہ) کے لخت جگر، اے عبد المطلب کے نور العین درشن دو، اے پربھو، پرم آتما، پرشوتم، درشن دو، اے ارض پاک کے تاجدار اور خلقت کے مبتدا و منتہا، — خواب راحت سے بیدار ہو کر درشن دو، اے رحم و رافت کے پیکر اعظم اُس کو درشن دو جس کی زندگی

اور زندگی کی تمام اُمیدیں تمہاری زیرِ لب مسکراہٹ اور نگہِ نیم باز سے وابستہ ہیں۔

درشن دو اے رام و کرشن کا رُوپ دھارن کرنے والے بھگوان پھر اپنی موہنی مورت اپنے اسّی کروڑ داسوں اور داسیوں کو دکھاؤ جن کی زندگی اور زندگی کا چین تمہاری نظرِ کرم کا محتاج ہے۔

اپنے بھگت کو درشن دو، اے آمنہ کے کلیجہ کی ٹھنڈک، درشن دو۔ اے پہاڑ کی گپھا (حرا) میں تپشیا کرنے والے جگت موہن تپسوئی، درشن دو۔ اے جٹا دھاری فاتح سنسار کہ تم کو لولاک لما خلقت الافلاک کا تاج اس لئے عطا کیا گیا تھا کہ تمہارے ذریعہ سارے سنسار کا کلیان ہوگا۔

درشن دو اے ادھرمیوں سے کلیش اُٹھانے والے آقا، درشن دو اے غلاموں کو آزادی دلانے والے مولا، درشن دو، اے بوریہ نشین تاجدارِ ذی وقار، درشن دو، اے منکشفِ اسرارِ خفی و جلی، درشن دو۔ اے خلقِ عظیم کے مخاطب درشن دو۔ اے ہادی اعظم اور سردار امم درشن دو۔ اے جمیلِ مطلق کے جمال کی چھبی، اور اس کو درشن دو، جو تمہارے آستانِ کرم پر انتہائی مایوسیوں سے ناکامیوں کی حالت میں اس لئے حاضر ہوا ہے کہ تمہارے درشنوں سے اس کی تمام تکلیفیں راحتوں سے بدل جائیں گی۔ اور تمام مایوسیاں کامیابیوں میں مبدل ہوں گی کہ اس کے درد کا مداوا اسی در سے ہوگا۔

درشن دو بیکسوں کے چارہ ساز، یتیموں کے والی — اپنے اس

غلام کو درشن دے کر اُس کی سنو، جس کی نیازمندی اور بیچارگی کا سہارا صرف تمہارا جمالِ جہاں آرا ہے ـــــ اس کے من کی بپتا سنو، جس نے اپنی تمام آرزوئیں تمہارے آستانۂ کرم سے اے ارضِ حرم کے تاجدار وابستہ کردی ہیں۔ اور جس کے زخموں کا مرہم اسی آستانۂ قدس کی خاک پاک ہوگی۔

درشن دو انگشتِ شہادت سے چاند کو دو ٹکڑے کرنے والے جگ جوتی، نورالعالم کہ تم کو وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی سے مخاطب کیا گیا ہے۔

درشن دو زُلفوں والے آقا، درشن دو، کمبلی والے شہنشاہ کہ تم کو یا ایہا المزمل! یا ایہا المدثر کے نام سے پکارا گیا ہے۔

تم کو اس زُلفِ دوتا کی قسم درشن دو جس کو واللیلِ اذا یغشٰی سے تشبیہہ دے کر تمام عالم میں سربلند کیا گیا ہے۔

درشن دو سندر رُوپ ساجن، اکاش بانی مہاآتما کہ تمہاری مہما کے گیت اس سمہ سارے سنسار میں گائے جارہے ہیں۔

درشن دو مہاسندر حسین کامل، مظہرِ الٰہی، ایشور روپ، جمالِ ربی کہ تمہارے غلاموں کے من کا کلیش تمہارے درشنوں سے دور ہوگا۔

درشن دو، سچائی کا پیغام لانے والے سجنا، پریتم پیارے درشن دو۔ شام کے مرغزاروں میں، افریقہ کے ریگزاروں میں، یورپ کے عشرت خانوں میں، ایشیا کے زوال پذیر ایوانوں میں، ہندوستان

مکانوں میں کہ آج سب نے تمہاری تعلیم کو بُھلا دیا ہے، اور ان سب کی مکتی تمہاری اور صرف تمہاری پوتر تعلیم سے ہوگی۔

درشن دو یا۔ رہبر مٹھی بھر جاں نثاروں سے لاتعداد دشمنوں کو شکست دینے والے سینا پتی کہ تمہارے درشنوں کی آسا لگی ہے۔

درشن دو مکہ کے ایذا دہندوں کو لا تثریب علیکم الیوم کا آزادی بخش نغمہ سنانے والے پریم مورت، پریم دھنی، کہ تمہارے غلاموں کی بے چارگی اب حد سے بڑھ گئی ہے۔

پریتم پیارے، ان رس بھرے نینا کی قسم جن پر رفیقِ غارؓ نے سب کچھ تج دیا تھا، اور جن کو دیکھکر فاروقِ اعظمؓ کے ہاتھ سے تلوار ہی نہیں گری بلکہ فاروقی سطوت نثار ہوئی۔ ہاں ہاں اُنھیں رس بھری آنکھوں کی قسم جن کو دیکھکر وحشیانہ مظالم برداشت کرنے کے بعد بلالؓ احد احد کہتے ہوئے اُٹھتے تھے۔ درشن دو۔ اور اس مکہ کی گلیوں میں درشن دو جس میں تمہارے راستہ میں کانٹے بچھائے گئے۔ تم پر قاتلانہ حملے ہوئے، تمہارا بائیکاٹ کیا گیا۔ اور تمہارے دعوائے نبوت کو جھٹلا کر تم کو جادوگر بھی بتایا گیا۔ اسی مکہ میں درشن دو جس میں نجدی وحوش نے تمام وہ عمارتیں مٹا دیں جن کو دیکھ کر تمہارے بچپن کی، تمہارے صفا کی یاد تازہ ہوتی تھی۔

وہی مست نرگسی آنکھ نور کے گھونگھٹ سے کھولو، پریتم پیارے جس کی دید کی تمنا عیسیٰؑ و موسیٰؑ وگوتمؑ وکرشنؑ کو تھی اور جس نے علیؓ جیسے فرزانہ کو

دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اور اسی علیؑ کا صدقہ درشن دو جس کو تم نے انا مدینۃ العلم و علی بابہا کا مجد و شرف بخشا۔

درشن دو اے وہ دنیا کے بہترین فیلڈ مارشل جن کے نقشے کبھی غلط نہیں ہوئے۔ اور جو ایسے سینا پتی تھے کہ اپنی سینا کے ساتھ خندقیں کھودتے، پہرہ دیتے اور حریف پر حملہ آور ہوتے تھے۔

میٹھے بول بولنے والے ساجن درشن دو۔ اور دیکھو کہ تمہاری پاک زندگی پر ناپاک حملوں سے تمہارے داس کیسے مضطرب ہیں۔

اونٹوں اور بکریاں چرانے والوں کو شہنشاہ بنانے والے داتا صدقہ اُن کا جن کو تم محبت سے حمیراؓ کہتے تھے، صدقہ خاتونِ جنتؑ کا۔ اور ہاں صدقہ زُلفوں والے حسنؑ حسینؑ کا، درشن دو، صدقہ اس مقدس لہو کا جو حق و صداقت کے لئے احد کے میدان میں تنِ نازنین سے نکلا اور جس کے نکلتے ہی کائنات کی بساط اُلٹ جاتی، اگر تم رحمت اللعالمین نہ ہوتے۔ درشن دو، اویس قرنیؓ کی آہِ جگر سوز کے صدقہ میں درشن دو۔ اور دیکھو کہ آج تمہارے داس تمہارے بتائے ہوئے راستہ سے بھٹک رہے ہیں۔

صدقہ اس مقدس قافلہ اہلِ بیتؑ کا جس کے پونتر خون سے کربلا کے تپتے ہوئے ریگ زار میں تخم حق پسندی کی آبیاری کی گئی، درشن دو، اور محبکو اس در سے مایوس نہ بھیجو جس کے بھکاری بڑے بڑے تاجدار ہیں۔ اور جو کبھی مدینے والے پیا تمہارے در سے خالی نہیں گئے۔

تمہارا غلام تم سے حکومت نہیں چاہتا کہ حکمرانوں کے مظالم سنکر لرزنے لگتا ہوں، تم سے خزانہ نہیں مانگتا کہ سرمایہ داروں نے غریبوں پر زندگی دو بھر کردی ہے۔ اور تم ہمیشہ غریبوں کو پسند کرتے تھے۔ تم سے ولایت نہیں چاہتا۔ کہ اس کا اہل نہیں۔ میں تو صرف سکون کا مل، راحت دل، آب چشم، اور وقت خوش مانگتا ہوں، اور اسی کے لئے تمہارے درشنوں کا ابھلاشی ہوں۔ تمہارے اور صرف تمہارے ناکارہ غلام کے من کی آشا تمہارے اور صرف تمہارے درشنوں سے ہوگی جو تمہارے درشنوں کی آس پہ جی رہا ہے۔

(پیشوا بابتہ ماہ جولائی و اگست ۳۸ء)

آشا لگی مَن کی

(۷)

مجھ پاپی نراشا کے مَن کو آشا لگی ہے۔ مدینہ والے شیام تم سے کہ تم دُعائے خلیلؑ۔ نویدِ مسیحؑ۔ بشارات بُدھ۔ کرشن اور رام چندر کا ظہور بھی آشا دو، جگ داتا، پریتم پیارے، سندر رُوپ، پریم مورت، گھنشیام سُندر، جگت موہن۔ کہ اس سنسار میں سب ہی نر ناری نراشا ہیں۔ اور اُن کے من کا کلیش تمہاری اور صرف تمہاری آشا سے دُور ہوگا۔

آشا لگی ہے تم سے غریبوں کی۔ یتیموں کی، بیواؤں کی، مزدوروں کی، محکوموں کی، بے روزگاروں کی۔ ساری دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں کی، کہ تم ہی اس سمے ان کا بیڑا پار لگاؤ گے۔ جب کہ یہ سب طرف سے نراشا کے ساگر میں غوطے کھا رہے ہیں۔

تم سے آشا لگی ہے اے جمال روپی، جگ جوتی، مہا گرو سندر روپ پریم دھنی۔ سچائی کا پیغام لانے والے سجنا، جگت گرو۔ تمہارے اسّی کروڑ غلاموں کو جب کہ دنیا میں اُن کے لئے عزّت کا کوئی مقام نہیں رہا اور وہ تمہارے پیغام کو بھلا کر سارے سنسار میں ذلیل ہو گئے۔

آشا لگی ہے من کی اس زُلفوں والے داتا سے۔ کمبلی والے شہنشاہ سے جو مزمّل اور مدثّر کے پوتر نام سے پکارا گیا۔ اور جس کی

زُلف دوتا کو واللیل اذا یغشٰی سے تشبیہ دے کر سربلند کیا گیا۔

آشا لگی ہے من کی اس نُور کے پرگٹ میں آرام سے سونے والے حیات النبیؐ سے جس کے رَس بھرے نیناپر کائنات کا ذرہ ذرہ نثار تھا اور جس کی دید کے لئے کائنات کا ظہور ہوا۔

آشا لگی ہے من کی اُن سے جو نراشا کے سمے شانتی کا سندیسہ لیکر آئے۔ اور آج بھی اُن کے پوتر نام کی سُمرن کے جاپ سے نراشا دُور ہوتی ہے

آشا لگی ہے مَن کی اُن سے جنھوں نے پستوں کو بلند اور بلندوں کو انسان بنایا۔

آشا لگی ہے من کی اُن سے جنھوں نے غلامی کا سدِباب کیا لیکن آہ تم آہ کہ آج اُن کے نام لیوا غلامی ہی کے پرچار میں مصروف اور غلامی ہی پر قانع ہیں۔

آشا لگی ہے من کی، سبز گنبد کے تاجدار تم سے مجبورہ کے مارے کی جس کی نیازمندی اور بے چارگی کا سہارا صرف تمہارا جمالِ جہاں آرا ہے، اور اُسی کی دید کی تمنا میں تمام آرزوئیں تمہارے آستانۂ کرم سے وابستہ کر رکھی ہیں۔

آشا لگی ہے من کی اس در سے جس کے بھکاری بڑے بڑے تاجدار ہیں اور جو کبھی مدینہ والے آقا تمہارے در سے خالی نہیں گئے۔ اور وہ آشا تمہارے اور صرف تمہارے درشنوں ہی سے پوری ہوگی جس کی آس پر جی رہا ہوں۔

حریت ۲۷ اپریل ۱۹۳۱ء

اپنی اُور دیکھ

(۸)

ہے سنسکار نرنکار! تیرے اس داس کو تیرے ملنے کی آشا نے بیاکل بنا رکھا ہے۔ دیکھنے میں کشل پر دک ہوں، پر ہے جیون پران اپنے ردھے کی کردکس پرکار سنوں، آؤ آؤ میری اکولت کی پیاس بجھاؤ۔ آؤ کیوں میرے دکھت ردھے پر، پربھو شوک کی شلا دھرتے ہو۔ تمہاری شکتی اسیم ہے کیا تم اتنا بھی نہ کروگے کہ میرے پاس آؤ۔ پربھو! میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا ہاں ایک بار تمہیں سپنے میں دیکھا تھا۔ آہا کیسا بھولین موہن روپ تھا پرنتو وہ مورتی اسی پرکار جھلک دکھا کر چھپ گئی۔ جس پرکار بجلی بادلوں میں اپنی مانا پرکرتی کو جھانک کر پھر بادلوں کی اوٹ ہو جاتی ہے۔ آؤ! میں تمہیں من مندر میں لے جاؤں گا۔ شردھا آسن پر بٹھاؤں گا۔ تمہارے پاؤں کی دھوون پیوں گا اور اپنے سو بھاگیہ پر گھمنڈ کروں گا۔

پریتم پیارے تم الکیش ہو، تمہارے داس کیوں الکیشن میں ہیں؟ تم سردیش ہو۔ ہم دوسروں کے داس بن کر کیوں رہیں۔ پوجیہ! تم جگت داتا ہو۔ تمہارے نام لیوا دوسروں کے آگے کیوں ہاتھ پھیلایا میں بیٹھو میرے ردھے مندر میں پرولیش کرنے والے دیکھو۔ میں تمہارا داس ہوں

میری لاج رکھنا، مجھے تم پر مان ہے۔ یہ مان نرسکار کی اگنی میں جلنے نہ پائے۔ اس سنسار کے رہنے والوں نے اپنا چار مچا رکھا ہے۔ دھرم پر، ادھرم کی بھاری مار ہے، آؤ اور دکھا دو کہ پتھر میں نہیں چمک ہیرے میں ہے۔ جھوٹ میں نہیں مہما سچ میں ہے

من کی اندھیری نگری میں اپنی پوتر سکھشا کے پھول برسانے والے تیرا یہ داس بھی شتروں کے جال میں پھنسا ہے۔ گیان کا دیا بجھ گیا ہے۔ ہے پربھو! ہے مادھو! دیکھنا یہ چکو رچٹ رمان کو تیاگ کر پٹ بجنے کی اور درشٹی نہ لائے۔ گیان کو چھوڑ کر اگیان پر دھیان نہ دے۔ یدی ایسا ہی ہوا تو ہمارا کیا ہے۔ لوگ باگ تمہیں دوش دیں گے۔ کہ ایسے شکتی مان کے داس اور اُن کے یہ دُربھاگ! دوش ہمارا ہی سہی پرنتو کیا کہیں۔

اپنی اُور دیکھ

(حریت ۵ مارچ ۱۹۱۲ء)

اُٹھو

(۹)

پریشاں حال امت ہے محمد مصطفےٰ اُٹھو بنی ہے مسلموں کی جان پہ بہرِ خدا اُٹھو
تمہارے روضۂ اقدس پہ اعدا کی نگاہیں ہیں انھیں تم دو سزا یا اب حمزہ ا بہرِ خدا اُٹھو

اُٹھو گیسوؤں والے اُٹھو، آمنہ کے کلیجے کی کور اُٹھو، عبداللہ کے نورالعین اُٹھو۔ ارضِ پاک کے تاجدار اُٹھو۔ خلقت مخلوق کے مبتدا و منتہیٰ اُٹھو۔ اے رحم ورافت کے پیکرِ اعظم اُٹھو، اور خوابِ راحت سے بیدار ہو کر اس کی سنو، جو تمہاری بارگاہ کو آخری جائے پناہ سمجھ کر آیا ہے۔

اٹھو اقلیمِ قاب قوسین کے مالک، اُٹھو ارضِ پاک کے بوریا نشین شہنشاہ، اُٹھو اے خلقِ عظیم کے مخاطب، اٹھو اے انکشافِ اسرار ہو، اٹھو رحمت للعالمین، اٹھو اے ہادیِ اعظم اور اے سردارِ امم، اٹھو اے جبّارِ مطلق کے جمال، اٹھو اے مالکِ کون و مکان، اور اس کی سنو جو انتہائی مایوسیوں اور ناکامیوں کے بعد تمہارے آستانِ کرم پر اپنے دُکھے ہوئے دل کی آخری فریاد لے کر حاضر ہوا ہے — اپنے غم زدہ دل کی تسکین اور راحت کی ہر اُمید اسی آستانۂ پاک سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔

آنکھیں کھولو عبدالمطلب کے لاڈلے، اٹھو بلدِ امین کے شہریار، خوابِ راحت سے بیدار ہو، صاحبِ معراج، ہوشیار ہو، عزم و استقلال کے

کو وقار، اٹھو اے یتیموں کے والی، غلاموں کے مولیٰ، بے کسوں کے آقا، اٹھو میرے مالک، اور اپنے غلام کی داستانِ درد سنو کہ اس کی نیازمندی اور بیچارگی کا سہارا صرف تمہاری ذات ہے، اور اس نے اپنی تمام آرزوئیں اے ارضِ حرم کے تاجدار اسی آستانۂ قدس سے وابستہ کر دی ہیں جو بیکسوں کا آخری ٹھکانا ہے۔

دیکھو ابلیسِ لعین کی فوجیں ہر طرف سے اُمڈی چلی آ رہی ہیں۔ جنودِ الشیاطین نے تمہاری محبوب اُمّت کو گھیر لیا ہے۔ آسمانی چاند کو انگشتِ شہادت کے ایک اشارے سے دو ٹکڑے کرنے والے آقا دیکھو کہ تمہارا پیارا اسلام، آہ وہ اسلام جس کی آبیاری کے لئے تم نے اپنے دندانِ مبارک سے احد کے میدانِ کارزار میں اپنے مقدس خون کے قطرے گرائے اور ہاں جس کی سرسبزی کے واسطے زلفوں والے حسینؓ نے دشتِ غربت میں تمہاری اولاد کو کٹوا دیا۔ وہی پیارا اسلام آج نرغۂ اعدا میں ہے، اور آہ کہ آج اسکی تباہی کے درپے دشمنوں سے زیادہ خود اس کے نام لیوا ہیں۔

بکریاں اور اونٹ چرانے والوں کو شہنشاہ بنانے والے داتا! شام کے مرغزاروں کو دیکھو کہ وہاں تمہارے غلاموں پر کیسی بن رہی ہے رلیف و مراکو کی سرسبز وادیوں پر نظر ڈالو کہ تمہارے نام لیوا صرف خدائے قدوس کے نام کی سربلندی کے لئے شمشیر بکف ہیں۔ ذرا ٹرکی کی حالتِ زار پر بھی توجہ ہو کہ کس طرح حریت و مساوات کے نام سے ظلم ہو رہا ہے۔ اور آہ کہ وہ اسلام کی محافظ تلوار جو سات سو سال تک شرفِ توحید کے لئے میان سے

باہر نکلی۔ آج اس پر مغربی تمدن کی صیقل ہو رہی ہے۔ افغانستان کے دیندار اور محافظِ اسلام اور محبوب المسلمین بادشاہ کو دیکھو جو تمہارے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا ہے۔ مگر اغیار اس کے آزاد ملک کو حرص و آز کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ نوجوان ایران کو دیکھو جو آزادی کے میدان میں دوڑنا چاہتا ہے مگر پیروں کے شل ہو جانے کی وجہ سے دوڑ نہیں سکتا۔ ہندوستان کے دس کروڑ محکوم غلاموں پر ایک نظر ڈالو، جن کو افتراق کی لعنت نے گھیر لیا ہے اور جن پر ارتداد کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ جن پر افلاس و بے دینی کی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔

جنگل کے پرندے۔ بھٹوں کے درندے آرام سے ہیں۔ مگر تمہارے نام لیوا ہندوستانی غلام بے چین ہیں۔ زندگی اور موت کے درمیانی وقفہ کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کس مپرسی کی حالت میں گزار رہے ہیں۔ تو پھر کیا اے مجسمۂ رحم و کرم تم ان کی دستگیری نہ کروگے؟

اور ہاں اس سرزمین کو بھی دیکھئے جس کو آپ کی ولادت کا فخر ہے جس کو قرآن حکیم میں بلد الامین کہا گیا ہے۔ کہ آج وہاں مسلمانوں کے لئے آپ کے جانثاروں کے لئے، آپ کے پاک اسلام کے نام لیواؤں کے لئے امن نہیں رہا۔

نانا جان! مکہ کے تمام مقدس مقامات ظالم اور وحشی نجدیوں نے مسمار کر دئے اور اس مقدس خطہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی جس کو آپ نے جنت البقیع سے مخاطب فرمایا۔ حجاز کی سرزمین پر جدھر نظر ڈالو گے یہی نظر

آئے گا کہ بجز صفت نجدیوں نے کتاب وسنت کا نام بدنام کرنے والے یاجوج و ماجوج گروہ نے اگر ایک طرف تمہارے عم محترم کے مزارِ پاک کو گمنام کیا ہے۔ تو دوسری طرف زُلفوں والے امام حسنؓ، امام محمد باقرؒ اور دیگر اہلِ بیت کرام وصحابۂ عظام کی ہڈیوں کو بے چین کیا ہے۔

آہ کہ ان کی وحشیانہ دست بردسے کوئی تاریخی مقام، کوئی متبرک مزار محفوظ نہیں رہا۔ اور حد یہ ہے کہ کس زبان سے عرض کروں کہ اب آپ کی آرام گاہ پر بھی ان نام نہاد کتاب وسنت پر عمل کرنے والے لعینوں کی نظر بد ہے

صدقہ خاندانِ نبوت کے اس قافلہ کا جو کربلا کے بے برگ وبار ریگ زار میں لٹا۔ صدقہ اس لہو کا جو کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں تمہاری آل کا بہا۔ صدقہ حسینؓ کے سر بریدہ جسم کا، خدارا اُٹھو اور اپنے غلاموں کی تباہ حالی و زبوں طالعی کو اپنی ایک جنبشِ لب سے دُور کرو کہ اقبالمندی اُن کے قدم چومے۔

اے مہبطِ انوارِ وحی اٹھو، صدقہ خاتونِ جنت کے اُن نیلوں کا جو چکی پیسنے اور پانی بھرنے سے اُن کے تنِ نازنین پر تھے۔ صدقہ اویسؓ کی محبت اور بلالؓ کے تعلق کا اُٹھو اور ان نجدی وحشیوں کو اپنے اس ہاتھ سے جس کو ہجرت کی رات خدائے بزرگ و برتر نے وما رمیت اذ رمیت ولٰکن اللہ رمٰی اور ید اللہ فوق ایدیھم سے مخاطب کیا اور ہاں اس دستِ اعجاز سے جس کے ایک اشارے سے قمر شق ہوا۔ ان بے دین اور ملحد نجدیوں کو سزا دو، ورنہ یہ گستاخ تمہارے حلم کے غلط معنی لیں گے اور قیامت آنے سے پہلے دوسری قیامت بپا ہوگی۔

(پیشوا ۸ ستمبر ۲۶ء)

سلامِ فقیر بخدمتِ امیرؑ

(۱۰)

سلام ہو اُس نیّرِ سپہرِ کرامت پر جس کے آستانِ جلال کو بوسہ دینے کے لئے آفتاب مغرب سے واپس آگیا۔

سلام ہو اُس نیّرِ برجِ شرف پر جس کے حریمِ جمال کی سجدہ ریزیوں سے چاند اپنی پیشانی منور کرتا ہے۔

سلام ہو اُس شاہِ خیبر شکن پر جس کے زورِ یدالٰہی نے خیبرِ کفر کی دیواروں کو متزلزل کر دیا۔

سلام ہو اس قاتلِ مرحب پر جس کی برشِ ذوالفقار دشمنانِ توحید کے سروں کی بھینٹ طلب کرتی تھی۔

سلام ہو علمِ رسولؐ کے اس پاک دروازہ پر جس سے گزر کر منزلِ عرفان کا سُراغ ملتا ہے۔

سلام ہو اُس وفادار بھائی پر جس نے شبِ ہجرت اپنے بھائی کے بستر پر آرام فرما کر دشمنوں کی تیغ و سناں کو خندہ پیشانی سے لبیک کہا۔

سلام ہو ابوطالب کے اس جلیل القدر فرزند پر جس کا زچہ خانہ خدا کا گھر بنا۔

سلام ہو اُس خوش نصیب نوشاہ پر جس کی دولہن خاتونِ جنّت ہے۔

سلام ہو اس عظیم المرتبت باپ پر جس کے بچے جوانانِ بہشت کے سردار ہیں۔
سلام ہو اس دستگیر آقا پر جس نے اپنے نام لیوا کو شبیر کے منہ سے بچا لیا۔
سلام ہو اس مجاہد فی سبیل اللہ پر جس نے اپنے بیٹوں کو خدا کی راہ میں قربان کر دیا۔
سلام ہو اُس عاشقِ رسولؐ پر جس نے نعشِ رسولؐ کی حرمت پر تاج و سریر خلافت کو ٹھکرا دیا۔
سلام ہو اس پیکرِ ایثار پر جو خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلاتا تھا۔
سلام ہو گل کدۂ ایمان کے اُس مالی پر جس نے اپنے جگر پاروں کے خون سے توحید و ایقان کے درختوں کو شاداب کیا۔
سلام ہو اس جلیل الشان بندہ پر جو نصیریوں کا خدا کہلایا۔ لیکن خود اُس کو اپنی بندگی پر ناز تھا۔
سلام ہو اُس پر جس کا نام خدا کا نام ہے۔
سلام ہو اس پر جس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ اور جس کا جسم رسولؐ کا جسم ہے۔
سلام ہو اس ندیمِ خدا پر جس کے قبضہ میں ساری خدائی ہے۔
سلام ہو خمخانۂ غدیر کے اس ساقی پر جو بارگاہِ رسالتؐ کے متوالوں کا مولیٰ ہے اور جس کے ساغر میں کوثر چھلکتا ہے۔
سلام ہو اُس سلطانِ ولایت پر جس کے دروازے سے غوثیت و قطبیت کی بھیک ملتی ہے۔

سلام ہو اس شحنۂ نجف پر جس کی دستگیری سے درماندگانِ منزل کو راہِ معرفت ملتی ہے۔

یا علیؑ مشکلِ ہر طائفہ آساں کردی
لیکن امروز بمن آنچہ بہ سلماں کردی

سلام اُس کو جو جامع کمالاتِ انسانی تھا

سلام اُن پر جن کی ولادت ۱۳ رجب کو ہوئی، اور شہادت ۲۱ رمضان کو ہوئی۔

سلام اُن پر جنھوں نے دنیا میں سب سے پہلے آنکھ کھولی تو جمالِ جہاں آرا کے درشن کئے۔

سلام اُن پر جو دنیا میں سب سے پہلے مسلمان تھے۔

سلام اُن پر جنھوں نے اپنے عم زاد بھائی کی رفاقت اور اسلام کی حمایت کے لئے والدین کے حکم کی نافرمانی کی۔

سلام اُن پر جنھوں نے تلواروں کے سایہ میں اپنے بھائی اور خدا کے رسولؐ کی جگہ شبِ ہجرت بسر کی۔ اور اپنی جان کو انتہائی خطرہ میں ڈال کر تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی خطرات کی پرواہ نہ کی۔

سلام اُن پر جن کی شمشیر خارا شگاف نے معاویہ کے باپ کی پیدا کی ہوئی تمام لڑائیوں میں اسلام کی حمایت کی۔

سلام اُن پر جنھوں نے بدر میں معاویہ کے ماموں اور دادا اور عرب کے سب سے بڑے جرنیل ولید کو قتل کیا۔ اور احد میں معاویہ کے باپ کے

حامیوں اور شمعِ نبویؐ کے دشمنوں سے آقائے کائنات کی حفاظت کے لئے جان خطرہ میں ڈال دی۔

سلام اُن پر جن کو مدینہ والے آقا نے اپنی سب سے زیادہ چہیتی بیٹی کا شوہر منتخب کیا۔

سلام اُن پر جن کی شان میں آیۂ تطہیر نازل ہوئی۔

سلام اُن پر جن کے مرتبہ کو آقائے نامدار نے خم غدیر میں مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ فرما کر بلند کیا۔

سلام فاتحِ خیبر کو، سلام حق کے داعی کو اور رسول پاکؐ کے بھائی اور وصی کو، سلام حکومتِ الٰہیہ کے وزیر کو۔

سلام اُن پر جن کو سرکار نے اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا فرمایا۔

سلام بہ شہیدانِ ستم!

(۱۱)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّم

سلام اُن پر جنھوں نے اپنے سرفروشانہ جذبہ اور پیغمبرانہ اعمال سے حق و صداقت کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو منجدھار سے نکال کر اُمّتِ مُسلمہ کا بیڑا پار لگا یا۔

سلام اُن پر جنھوں نے لاکھوں یزیدی اشقیا کے جبر و ستم کا مقابلہ کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں کیا کہ یہ دلیری بنی فاطمہ کا ہی ورثہ ہے۔

سلام اُن پر جن پر کئی کئی دن پانی اور غذا بند رہی۔ مگر وہ جبر و ستم کی قوت سے کذب و باطل کے سامنے نہ جھکے کہ یہ صبر خاندانِ نبوت کا حصّہ تھا۔

سلام اُن پر جن کو آقائے نامدار نے اپنا فرزند کہا۔ اور جو راکب دوشِ پیغمبر تھے۔ اور جو صورت و سیرت میں رحمتہ اللعالمین سے مشابہ تھے۔

سلام اُن پر جن کی معصومیت و مظلومیت پر آسمان کے لا تعداد فرشتے اور زمین کی ہر ذی رُوح ہستی شاہد ہے۔ اور آسمان تیرہ سو سال سے آنسو گراتا ہے۔ جو زمین پر سب سے زیادہ ستائے گئے اور جو ایسی ہولناک مصیبت کے وقت جبل الطارق کی مضبوط چٹان کی طرح ثابت قدم رہے کہ آلِ پیغمبر

سے اسی کی تو قع تھی۔

سلام سادات بنی فاطمہؑ کے سالارِ اعظم پر جن کے مقدس خون کی بوندیں دنیا کے سب سے بڑے سفاک، جابر و ظالم انسانوں کی ہلاکت کا باعث بنیں۔

سلام کوفہ کے اُس پردیسی مسافر مسلمؑ پر جو نابکار کوفیوں کے دامِ فریب میں گرفتار ہو کر دشتِ غربت میں شہید ہوا۔ مگر نابکار ابنِ زیاد کی اطاعت سے دمِ واپسیں تک انکار کیا، کیونکہ معیت کے وقت حق و صداقت سے انحراف اسلامی تعلیم کے خلاف تھا۔

سلام مسلمؑ کے ان دونوں شب چراغوں پر جو طوعہ کے تاریک نہ خانے کو منور کر رہے تھے۔

سلام مدینہ کے ان ننھے ننھے مسافروں پر جنہیں آغوشِ مادر و شفقتِ پدر نصیب ہونے کے بجائے زُلفیں پکڑ کے کوفہ کی گلیوں میں گھسیٹا گیا اور سُورج نکلنے سے پہلے اُن کے جسموں کو فرات کی طویل مگر خاموش لہروں کے سپرد کر دیا گیا اور جن کے مقبرے زمین کے بجائے شکمِ ماہی میں بنے۔

سلام اُس ننھی سی چیخ پر جو علیؑ اصغر کے معصوم اور خشک گلے سے دریائے فرات کے کنارے بزدل و نامرد یزیدی سپاہی کا تیر لگتے ہی نکلی اور آہ! ثم آہ!! ——— اس چیخ کے بعد باغِ حسینی کی یہ ناشگفتہ کلی ہمیشہ کے لئے مُرجھا گئی۔

سلام علی اکبرؑ کی اس جوانی پر جس کی بہار شہادت زار کربلا میں لُٹی اور دسویں محرّم کو بنی فاطمہ کے چمن کا یہ خوش نما کنول مُرجھا کر فنا کی

زمین پر ہمیشہ کے لئے سرنگوں ہو گیا۔

سلام علی عباسؑ کے اس دست بریدہ پر جو حق و صداقت کے پرچم لے کر فرات کے کنارے بلند ہوا اور جبر و ستم کی تلواروں سے قطع کر دیا گیا۔

سلام حُرؑ اور اُن کی اس تلوار پر جس کا قبضہ سرفروشی کی تمنّا سے پکڑا گیا۔ اور جس نے آلِ محمدؐ کے صدہا دشمنوں اور اسلام کے باغیوں کو جہنّم رسید کر کے امام مظلومؑ کے قدموں پر جان دی۔

سلام عونؑ و جعفرؑ پر جنھوں نے ماں کے حکم پر اسلام کی محبت میں تلوار چلا کر حق کی حمایت کی اور جامِ شہادت نوش کیا۔

سلام حسنؑ کے جگر گوشہ کو جو اپنے عمِ محترم کے "انبلاسۂ حسن" میں اسلام پر نثار ہوئے۔

سلام صبر و حلم، بے کسی و بے چارگی اور تسلیم و رضا کی اس شانِ ادا پر جو کربلا کے میدان میں جگر گوشۂ علیؑ اور فاطمہؑ کے لال سے ظاہر ہوئی۔ کہ بہتّر تنوں کو اسلام کی لاج رکھنے کے لئے اپنی آنکھوں کے سامنے بے آب و دانہ ذبح ہوتے دیکھا۔ اور رضینا برضاء اللہ کا نعرہ لگایا۔

سلام ریگ زارِ کربلا کے ایک ایک ذرّہ کو جس پر آلِ محمدؐ کے مقدّس و محترم خون کے قطرے جرمِ حق پرستی میں گرے اور بنیٔ فاطمہؑ کے بے گور و کفن لاشے مرغِ بسمل اور ماہی بے آب کی طرح تڑپے۔

سلام اُس سرِ مقدّس و اطہر کو جس پر اب سے تیرہ سو سال پیشتر محرّم کی دسویں تاریخ کو حالتِ نماز میں تلوار چلی۔

سلام اُن زخموں پر جو مردود عمرو بن سعد کے سپاہیوں کے تیروں، برچھیوں، تلواروں اور نیزوں سے سادات بنی فاطمہ کے تنِ نازنین پر تھے۔ اور جنھیں نہ کوئی دھونے والا تھا اور نہ کوئی مرہم پٹی کرنے والا۔

سلام اُس پاک اور محترم گردن کو جو سجدے میں تھی اور جس پر شمرِ ملعون نے تلوار چلائی۔

سلام بنی فاطمہؑ کے اُن سر بریدہ اجسام مقدس کو جو کئی روز کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں بے گور و کفن آسمان کی نیلی چھت کے نیچے پڑے رہے اور جن پر سوائے آسمان کے فرشتوں کے کسی نے اس وقت زمین پر آنسو نہ گرائے۔

سلام امامِ مظلوم اور سید الشہدا کی محترم گردن سے کٹ کر بہنے والی خون کی ان مقدس بوندوں کو جو جرمِ حق پرستی میں کربلا کی جھلستی ہوئی سرزمین پر ٹپکیں اور اس کے خشک ذرّوں میں جذب ہوئیں۔

سلام عزم و استقلال کے کوہِ وقار عابدِ بیمار پر جن کی آنکھوں کے سامنے خاندانِ نبوّت کا قافلہ لُٹا اور جن کے سامنے فاطمہؑ کے کلیجہ کی ٹھنڈک اور علیؑ کے نور العین کا سر تن سے جُدا کیا گیا۔ لیکن اُنکے پائے استقلال کو لغزش نہ ہوئی۔

سلام شہر بانوؑ کے اس صبر و ضبط کو جن کے لخت جگر نے اُن کی آغوش میں خشک حلق سے ہچکیاں لے کر آنکھیں بند کیں۔ اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر العطش العطش کہہ کر جان دی۔ جن کا گھر بار یزیدی ظالموں نے لُوٹ لیا۔ جنھیں اسیر کر کے شام کے بازاروں میں پھرایا گیا مگر اُنھوں نے صبر و رضا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور اس مصیبت عظمیٰ پر اُف نہ کی۔

سلام اُس مقدس اونٹ کو جس کی ننگی پیٹھ پر حسینؑ کے جگر گوشہ اور ناموس و عترتِ رسولؐ نے کربلا سے دمشق تک سفر کیا۔

سلام زینبؑ کے اس دلیرانہ بیان پر جو دعوتِ حق پرستی کے لئے شام کے سب سے زیادہ ظالم و جابر انسان کے سامنے بلاخوف دیا گیا کہ یہ دلیری بنی فاطمہؑ ہی کے ورثہ میں آئی ہے۔

سلام اُس قید خانہ کو جس میں رسالت پناہؐ کی اس اولاد نے جس پر دنیا کے مسلمان دن رات میں پانچ وقت درود بھیجتے ہیں۔ اپنے ایام اسیری نہایت صبر و استقلال سے گزارے۔

سلام محمدؐ کے اُن گھرانے والوں پر جن کی بدولت یزید کے پُر شوکت و پر ہیبت دربار میں نعرۂ حق پرستی بلند ہوا۔ اور جن کے سر پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹے۔ مگر انھوں نے مدینہ کے جگ داتا کی تعلیم سے منہ نہ موڑا۔

سلام اے بابا! اس عزم و استقلال کو جو شیرِ خداؑ کی اولاد سے کربلا کے

میدانِ ستم میں، کوفہ کے دربار میں، شام کے تاریک قید خانہ میں ظاہر ہوا جس سے سفاک و جابر حکمران، اُمّت کے سالار کا کلمہ پڑھنے والے کافروں کا دل نہ پسیجا۔

سلام عابدؑ بیمار کے اس صبر و رضا پر جو انھوں نے کربلا کے ریگزار میں ابن زیاد اور یزید کے درباروں میں ظاہر کیا کہ یہ حصّہ اولادِ رسولؐ ہی کا تھا۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

نشورات

دوزخ کا ایندھن

(۱۳)

اس زمانہ کا ذکر ہے جب مسلمانوں کے حسیات اس قدر مُردہ نہ ہوئے تھے کہ ایک رات خلیفہ ہارون رشید عباسی اپنے وزیر فضل برمکی کے ہمراہ سچے مردانِ خدا کی تلاش میں روانہ ہوا فضل سب سے پہلے ہارون کو بغداد کے مشہور ترین عالم سفیان عینیہ کے مکان پر لے گیا۔ مکان کا دروازہ بند تھا فضل نے دستک دی۔ اندر سے سوال ہوا "کون ہے" فضل نے اپنی شخصیت ظاہر کی۔ اور بتایا کہ حضرت امیر المومنین تشریف لائے ہیں۔ جلیل القدر شہریار بغداد کی تشریف آوری سے سفیان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گھبرا کر یہ کہتا ہوا باہر نکلا کہ امیر المومنین نے کیوں اس قدر زحمت فرمائی۔ مجھ کو بارگاہ عالی میں طلب فرما لیا ہوتا۔

ہارون الرشید کو خداوند کریم نے چشم امتیاز عطا کی تھی۔ اُس نے سفیان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور اپنے وزیر سے یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا کہ مجھے ایسے لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں۔"

یہاں سے فضل برکی خلیفہ ہارون الرشید کو حضرت فضیل ابن عیاضؒ کے آستانۂ اقدس پر لے گیا۔ جن کی نظر کیمیا اثر نے ابراہیم ادھم سلطان بلخ کو "سلطان العارفین" بنا دیا۔

مکان کا دروازہ بند تھا۔ اندر سے تلاوتِ قرآن شریف کی آواز آرہی تھی۔ ساتھ ہی ٹوٹے ہوئے دل کی آہیں بھی شامل تھیں۔ ہارون دیر تک مبہوت ہو کر قرآن شریف سنتا رہا۔ اس کے بعد فضل برکی نے دستک دی۔ اندر سے استفسار ہونے پر بتایا گیا کہ امیر المومنین اپنے وزیر اعظم کے ہمراہ تشریف لائے ہیں۔ مکان کا دروازہ نہ کھلا۔ اندر سے ایک خفیف آواز آئی کہ "مجھے بادشاہِ وقت سے کیا سروکار۔ بادشاہ کو مجھ فقیرِ بے نوا سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے"۔ وزیر نے کہا کہ "اطاعت اولوالامر فرض ہے"۔ حضرت فضیلؒ نے اندر ہی سے بیٹھے بیٹھے جواب دیا کہ "میں ابھی اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ہی کی منزل طے نہیں کر سکا۔ اطاعت اولوالامر تو بعد میں آتی ہے"۔ فضل برکی نے گرج کر کہا کہ "تم حسبِ دستور مکان کا دروازہ کھولو گے یا امیر المومنین حکماً اندر تشریف لائیں"۔ حضرت فضیل نے جواب دیا کہ "فقیر کے یہاں بادشاہ کے آنے کا کوئی دستور نہیں۔ بادشاہ صاحبِ قدرت ہے اگر وہ جبراً میرے مکان کے اندر داخل ہونا چاہتے ہیں تو میں کس طرح مزاحمت کر سکتا ہوں"۔ یہ سنکر ہارون الرشید بلا اجازت ان کے مکان کے اندر داخل ہوا۔ حضرت فضیلؒ نے خلیفہ کی صورت دیکھتے ہی جلدی سے چراغ گُل کر دیا۔ ہارون الرشید نے تاریکی میں جب مصافحہ

کے لئے ہاتھ بڑھایا تو حضرت فضیل ابن عیاض یہ کہہ کر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے کہ ما الین ھٰذا الکلف لو نجا من النار (یہ ہاتھ کس قدر نرم ہے میں کاش آتش دوزخ سے نجات پا جائے۔)

نماز کے بعد حضرت فضیلؒ نے خلیفہ ہارون الرشید کو کس قدر تلخ نصیحت کی۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ لیکن اس قدر لکھنا کافی ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید روتے روتے بیہوش ہو گیا اور چلتے وقت جب اُس نے ایک ہزار اشرفیوں کی تھیلی خدمت اقدس میں پیش کی تو حضرت فضیلؒ نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ "میں نے تم کو آتش دوزخ سے بچانے کی تدبیر کی اور تم مجھ کو دوزخ کا ایندھن بنانا چاہتے ہو۔ کیا دُنیا میں حسنِ سلوک کا بدلہ یہی ہے؟

مسلمان آج ذلیل ہیں خوار ہیں۔ یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ اسلام کی سچی رُوح نہ دولت مندوں میں باقی ہے اور نہ زاہدانِ گوشہ نشین میں اغنیا اپنی شان میں تو تصنیف قصائد چاہتے ہیں۔ اور علماء اپنا تنورِ شکم بھرنے کے لئے چند روٹیاں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

(حریت ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء)

دل کی کثافت اور ضمیر کی سچائی

(۱۳)

کوئی قصہ نہیں، کہانی نہیں۔ بال کی کھال نکالنے والے مورخین نے لکھا ہے کہ ایک دن خلیفہ منصور عباسی نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ حضرت امام جعفر صادقؓ کو میرے دربار میں حاضر کرو تاکہ میں انھیں قتل کر کے اپنی تشنگی خون فرو کروں۔ وزیر صاحبِ ایمان تھا۔ اُس نے خلیفہ کو بہت کچھ سمجھایا کہ ایک سیدِ گوشہ نشین۔ ایک مظلوم فرزندِ رسولؐ۔ ایک اقلیم دل کے تاجدار فاطمی زادے کو بے جرم و خطا قتل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا منصور کی عقل پر پتھر پڑے تھے۔ اُس نے وزیر کو نہایت سختی کے ساتھ دوبارہ یہی حکم دیا۔

حکمِ حاکم مرگِ مفاجات سے کم نہیں۔ وزیر مجبور ہو کر حضرت امامت پناہ کے آستانۂ اقدس کی جانب روانہ ہوا اور یہاں منصور نے اپنے درباریوں کو حکم دے دیا کہ حضرت امام جعفر صادقؓ کی تشریف آوری کے لیے۔ جب میں عمامہ سر سے اتاروں تو تم لوگ فرزندِ رسولؐ کے پاک

خون سے میرے دربار کے فرش پر گلکاریاں کردینا۔

رات کا وقت تھا۔حضرت امام جعفر صادقؓ اپنے محبوبِ حقیقی کی یاد میں مصروف تھے۔ وزیر نے درِ دولت پر حاضر ہو کر دستک دی۔ بارگاہِ عالی کا دروازہ کُھلا۔ وزیر نے اندر داخل ہو کر سربسجود امام کو خلیفہ کا حکم سنایا۔حضرت امام عالی مقام نماز سے فارغ ہو کر نہایت اطمینانِ قلب کے ساتھ وزیر کے ہمراہ جانبِ دربار روانہ ہوئے۔ وزیر بار بار روئے روشن کی جانب دیکھتا تھا۔ اُسے حیرت تھی کہ فرزندِ رسولؐ کا کیا عزم و استقلال ہے موت کے منھ میں جا رہے ہیں مگر تیوری پر بل بھی نہیں۔

حضرت امام جعفر صادقؓ خلیفہ منصور کے دربار میں تشریف لائے۔ سر پر سبز رنگ کا بوسیدہ عمامہ۔ نورِ تطہیر میں ڈوبی ہوئی ردا میں درجنوں پیوند۔ پائے مبارک کی انگلیاں شکستہ نعلین سے باہر نکلی ہوئیں۔ مگر جانے اس بے سر و سامانی میں بھی کیا شانِ عظمت پوشیدہ تھی کہ سلطنتِ عباسیہ کا یہ جابر فرمانروا صورت دیکھتے ہی تعظیم کے لئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

حضرت امامِ پاک سلام سنون کے بعد نہایت لاپرواہی سے عباسی تاجدار کے برابر مسندِ شاہی پر بیٹھ گئے۔ پوچھا کہ "تو نے مجھے رات میں کیوں طلب کیا ہے"؟

ایک بے مونس و یار شکستہ حال فرزندِ رسولؐ کے اس سوال نے

افواجِ قاہرہ کے مالک منصور کو لرزہ براندام کر دیا جس زبان سے وہ چند منٹ پیشتر اپنے درباریوں کو حضرت امام جعفر صادقؓ کے قتل کا حکم دے چکا تھا۔ اُسی زبان سے اب جواب دیتا ہے کہ "یا فرزندِ رسول اللہؐ مجھے آپ کی زیارت کا اشتیاق تھا۔ اگر آپ کے دل میں کوئی خواہش ہو تو ظاہر فرمائیے۔ تاکہ میں وہ پوری کر دوں"۔

حضرت امام صاحبؓ بلا تامل جواب دیتے ہیں کہ "تجھ سے میری خواہش صرف یہ ہے کہ اب تو مجھے کبھی اپنے دربار میں طلب نہ کرنا۔ اس سے میری عبادت الٰہی میں خلل پڑتا ہے"۔ یہ فرما کر امام صاحب چلنے کے لئے اُٹھے۔ اہلِ دربار منتظر تھے کہ شکار ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ کب خلیفہ اپنے سر سے عمامہ اتارے اور کب ہم امام معصوم کو جامِ شہادت پلا دیں۔ لیکن کسی غیبی قوت نے سفاک و جابر منصور عباسی کے ہاتھوں کو جکڑ لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنا عمامہ سر سے اتاروں۔ لیکن اس کا ہاتھ عمامہ تک اُٹھتا ہی نہ تھا۔ حضرت امام جعفر صادقؓ دربار سے باہر تشریف لے آئے۔ خلیفہ امام صاحب کے جاتے ہی دربار سے چپ چاپ اُٹھ کر محلسرا میں چلا گیا۔ وہاں پہونچ کر اُسے بخار چڑھا۔ تین دن سرسامی حالت رہی۔ اس کے بعد طبیبِ مرگ نے اُس کو ہمیشہ کے لئے شفا دیدی۔

حاضرینِ دربار کا بیان ہے کہ خلیفہ منصور کو حضرت امام صاحب کی ہمراہی میں ایک خوفناک اژدہا نظر آیا تھا۔ اس کی ہیبت سے وہ بیمار ہو کر

مر گیا تھا۔

میں کرامتِ بزرگانِ دین کا منکر نہیں۔ لیکن اس واقعہ میں مجھکو ایک دوسری شان نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ خلیفہ عباسی کو جس چیز نے لرزہ براندام بنا دیا تھا وہ حضرت امام جعفر صادقؓ کے دل کی سچائی تھی۔ امام پاک جانتے تھے کہ میں حق پر ہوں۔ بے گناہ ہوں معصوم ہوں۔ اور میری مرگ و زیست خلیفہ منصور کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ لہٰذا حضرت امام کو کوئی خوف و اضطراب نہ تھا۔ اس کے مقابلہ پر منصور جانتا تھا کہ میں ایک بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے چاہتا ہوں۔ اس لئے اس کے ضمیر کی کثافت نے اس کو خوف زدہ بنا دیا تھا

(حریت ۷ نومبر ۱۹۱۲ء)

عدالت مجاز و حقیقت میں حاضری

(۱۴)

جمعہ کے دن میں تیزی کے ساتھ قدم بڑھائے ہوئے کچہری کی طرف چلا جا رہا تھا، ڈپٹی کمشنر کے اجلاس میں میرا ایک ضروری مقدمہ تھا۔ راستہ میں ایک مسجد ملی۔ مؤذن حی علی الصلوٰۃ کی تکرار کر رہا تھا۔ دل نے کہا تو بھی ایک مسلمان ہے۔ اس خدائی طلبی پر لبیک کہہ۔ لیکن نفس نے عدالتِ مجاز کے خوف سے ڈرا کر کہا ساڑھے بارہ بج چکے ہیں۔ ایک بجے مقدمہ شروع ہو جائے گا۔ میں نے نفس کا مشورہ قبول کیا۔ اور اس طرح لپکتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ گویا میں نے حی علی الصلوٰۃ کی آواز ہی نہیں سنی۔

میں کچہری کے احاطہ میں داخل ہوا۔ آنریری مجسٹریٹ سے لے کر تحصیلدار منصف۔ سب جج۔ غرضکہ ہر ایک ہندوستانی حاکم کے اجلاس پر مقدمات کی سماعت ہو رہی تھی۔ لیکن ڈپٹی کمشنر صاحب ٹھہرے آزاد قوم کے آزاد فرد۔ انھیں کیا ضرورت تھی جو صبح ہی سے اپنا بیش قیمت وقت ضائع کرنے کے لئے کچہری میں آجائیں۔ میں انتظار میں کچہری کے مختلف گوشوں

کی خاک چھانتا رہا۔ خدا خدا کر کے ڈھائی بجے ڈپٹی کمشنر صاحب کرسی عدالت پر رونق افروز ہوئے۔ میں ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا۔ دیکھئے میری طلبی کب ہوتی ہے۔ ٹھیک تین بجے چند روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے ایک چپراسی نے میرا نام اور صرف نام لے کر پکارا "فلاں حاضر ہے"

ایک چپراسی کی پُر رعب آواز سُن کر میرے ہاتھ پاؤں میں رعشہ آ گیا۔ دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ برآمدہ سے کمرۂ عدالت کی دہلیز تک جانا دشوار ہو گیا۔ حاضر حاضر کرتا ہوا دوڑا۔ چپراسی نے ڈانٹ بتائی۔ جلدی آؤ۔ کہاں کھڑے تھے۔

میں کمرہ میں فوراً داخل ہوا۔ صاحب بہادر کو فرشی سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ سب کچھ صرف چند سکنڈ کے اندر ہوا۔

اس واقعہ پر غور کیجئے کہ انسان کس قدر غافل۔ کور چشم اور ننگ کائنات ہے۔ وہ احکم الحاکمین جس کے سامنے دنیا کا بڑے سے بڑا حاکم بھی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہونے والے ملزم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے دربار میں طلبی سے کچھ دیر پیشتر جانا تو درکنار مسلمان خدائی نقیب کی روح پرور آواز حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الفلاح سنتا ہے اور منھ پھیر کر نکل جاتا ہے۔ لیکن ایک خاطی انسان کی عدالت میں سر کے بل جاتا ہے گھنٹوں زحمت انتظار گوارا کرتا ہے۔ ایک معمولی چپراسی انتہائی حقارت کیساتھ اس کا نام لے کر پکارتا ہے۔ اور وہ اس آواز پر لبیک کہتا ہوا دوڑتا ہے۔

کیا انسان اشرف المخلوقات ہے؟

ہمارا ایک معمولی مقدمہ ہو تو مہینوں پیشتر اس کے کاغذات مرتب کرتے ہیں۔ صفائی کے گواہ ڈھونڈھتے ہیں۔ ان کے گھروں پر دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں۔ وکیلوں کی ناز برداری کرتے ہیں۔ ایک مقدمہ کی فکر دنیا کی تمام فکروں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ لیکن کاش کبھی ہم یہ بھی سوچیں کہ ایک دن احکم الحاکمین کے دربار میں ہمارا وہ اہم ترین مقدمہ پیش ہونے والا ہے جس کی سزا و جزا چند روزہ نہیں بلکہ دوامی ہے۔ اس کے لئے ہم کیا تیاری کر رہے ہیں۔ کیا ہم نے اس سنگین مقدمہ کے کاغذات مرتب کرنے میں ایک منٹ بھی صرف کیا؟ کیا ہم نے اپنے حقیقی وکیل و شفیع (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خوشنودی حاصل کر لی؟ کیا اس مقدمہ کی خلش ہمارے دل نے کبھی ایک سکنڈ کے لئے بھی محسوس کی؟ کیا مقدمۂ آخرت کی فکر میں ہم نے کبھی دنیا کا کوئی کام چھوڑ دیا؟

(حریت ۱۵ نومبر ۱۹۳۲ء)

تصوّرات

(۱۵)

کل میرے ایک عزیز دوست کی سالگرہ تھی۔ دھوم دھام کے ساتھ دوستوں کی پُرتکلّف دعوت ہوئی۔ کوٹھی کے وسیع احاطہ میں کرسیاں بچھائی گئیں۔ میزیں آراستہ ہوئیں۔ نواکہات کی کوئی کمی نہ تھی۔ ایک سے ایک لذیذ مٹھائی میوے میز پر موجود۔ دوست احباب خلاک شگاف قہقہوں کے درمیان میں کھا پی رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مسرت تمام دنیا سے سمٹ کر صرف اسی مکان میں آگئی ہے۔ لیکن میں بزمِ احباب میں سر جھکائے ہوئے خاموش بیٹھا تھا۔ سوچتا تھا کہ اپنے پیارے دوست کو کن الفاظ میں مبارکباد دوں؟ اور کس بات پر اظہارِ مسرت کروں؟

میرے دوست اگر چوبیس سال کے تھے تو اس پُرمسرت جشن کے موقع پر ۲۵ برس کے ہوگئے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ اگر ان کی زندگی میں پچاس برس باقی تھے تو اب انچاس سال باقی رہ گئے۔ یعنی عمر میں ایک سال بڑھا نہیں بلکہ ایک سال کم ہوگیا۔

کیا میں اس بات پر اظہارِ مسرت کروں کہ میرے دوست کی زندگی میں

ایک سال کم ہوگیا۔ یا اپنے دوست کو اس امر پر مبارک باد دوں کہ انھوں نے منزلِ گور کی جانب ایک قدم اور آگے بڑھایا؟

(۲)

راتوں کی خاموشی میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ حیرت انگیز کونسی بات ہے؟ کبھی تاج محل کا روضہ اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ میری نگاہوں کے سامنے آتا۔ کبھی دہلی کی عظیم الشان عمارت مجھے بحرِ تحیر میں غرق کرتی۔ کبھی قوتِ متخیلہ بابل کے معلق باغوں کا نقشہ میرے سامنے پیش کرتی۔ کبھی اہرامِ مصر میری نگاہوں کو دعوتِ استعجاب دیتے۔ لیکن میری پریشان خیالی ان تمام چیزوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتی تھی برسوں یہ راز مجھ پر حل نہ ہوا۔ لیکن ایک دن حقیقت کی رعنائیاں میرے سامنے بے نقاب ہوگئیں اور میرا دل پکار اٹھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ کوئی بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ دنیا کے رہنے والے یہ جاننے کے باوجود بھی کہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، معلوم نہیں موت کس وقت آجائے۔ اپنے کاروبار میں اس قدر غافل نظر آتے ہیں کہ انھوں نے آبِ حیات کے چند گھونٹ پی لئے ہیں۔

(۳)

لوگ کہتے ہیں کہ موت بری چیز ہے۔ وہ دوستوں کو دوستوں سے

جدا کرتی ہے۔ لیکن نہیں۔ انھوں نے موت کی حقیقت پر ایک دن بھی غور نہیں کیا۔ موت بُری چیز نہیں۔ وہ دوستوں کو دوستوں سے جدا نہیں کرتی۔ بلکہ اچھی چیز ہے۔ دوست اور دشمن کو گلے ملاتی ہے۔

جب ہم اپنے کسی دشمن کی قبر پر گزرتے ہیں تو ہماری زبان سے بےساختہ نکلتا ہے کہ "افسوس چند روزہ زندگی اور عارضی شکایتوں کے لئے ہم نے اس خاک کے تودہ سے فضول عداوت کی ٹھانی تھی"۔

لہٰذا کیا یہ کہنا غلط ہے کہ موت بشریت کو صلح و دلجوئی کا سبق سکھاتی ہے؟

---

(۴)

تجربہ بتاتا ہے کہ محسوسات میں وہ چیزیں جو بظاہر دلفریب اور بھڑکیلی معلوم ہوتی ہیں اکثر ناپائدار و ناکارہ ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن حضرت انسان بھی کس قدر بے وقوف ہیں کہ عقل کے مشاہدہ کے خلاف عمل کرکے نقصان اُٹھاتے ہیں۔ وہ ان ظاہری دلفریبیوں پر ایسے دل فریفتہ ہوتے ہیں کہ مآل اندیشی کا نقش اپنے دل سے مٹا دیتے ہیں۔ اور اس عالم خیرگی میں کسی مستقل اثر و نتیجہ کے امیدوار ہوتے ہیں۔

کاش حضرتِ انسان کی چشم بصیرت وا ہو اور دنیا کی ظاہری دلفریبیوں کے پھندے میں پھنس کر اُس آخرت کی جانب مائل ہوں جو بادی النظر میں نیا و دلفریب تو نہیں لیکن مستقل اور دائمی ہے۔

(حریت ۲۱ دسمبر ۱۹۳۳ء)

پیا ملن کو جانا

کرلے چتر سنگار ساجن پیا ملن کو جانا

(۱۶)

اُس دیس جانا ساجن، جو اونچے اونچے کالے کالے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔

اس دیس جانا ساجن، جہاں گورے کالے۔ اُجلے میلے، اونچے نیچے سب کا ایک ہی سا لباس ہے۔ کہ پیا پیارے کو دوئی سے نفرت ہے۔

اس دیس جانا ساجن، جہاں مہا گرو۔ سندر روپ۔ اکاش بانی، پریم پیارے، مہا بلوان نے جنم لیا۔

اس دیس جانا ساجن، جس میں دنیا کے نجات دہندہ کو پتھر مارے گئے۔ غلاظت ڈالی گئی۔ کانٹے بچھائے گئے۔ دیس نکالا ملا۔ لیکن دیس کی محبت تازیست آقا کو رہی کہ حب الوطن من الایمان کا درس اپنے داسوں کو عمل سے دینا تھا۔

اس دیس جانا ساجن، جہاں جات پات نہ پوچھے کوئی۔ ہر کو بھجے

ہر کا ہوئے پر عمل ہوتا ہے۔

اُس دلیس جانا ساجن جہاں دنیا کو آخری پیغام نجات دیا گیا۔

اس دلیس جانا ساجن، جہاں نور کی بارش ہوتی ہے۔ جہاں قدسیوں کا نزول ہوتا ہے۔ جہاں دنیوی آلائشوں، مغربی دسیسہ کاریوں۔ سرمایہ دارانہ شیطنتوں کا گذر نہیں۔

اس دلیس جانا ساجن جو وادیٔ غیر ذی زرع ہے۔ جہاں زہریلی گرم ہوائیں چلتی ہیں۔ جہاں ریت کے بگولے آسمان سے باتیں کرتے ہیں جہاں اونٹ اور کھجور ہی انسان کی کل کائنات ہے۔

اس دلیس جانا ساجن، جہاں ترکِ مال و ترکِ جان و ترکِ سر و طریقِ عشق اول منزل است پر عمل کرنے والے کفن بردوش جاتے ہیں۔

اس دلیس جانا ساجن، جہاں اندھیری رات میں، شبِ ہجرت کو وصی رسولؐ۔ مولیٰ علیؑ نے دنیا کا سب سے بڑا امتحانِ محبت دیا۔

اس دلیس جانا ساجن، جہاں انسانی اخوت، محبت، آزادی حریت مساوات کا سب سے پہلا اور سب سے آخری پیغام سنا کر عمل کیا گیا۔

اس دلیس جانا ساجن، جہاں درندوں کو انسان، انسانوں کو بہت ہی قلیل عرصہ میں فرشتہ بنا دیا گیا۔

ایسے دلیس جانے کے لئے ساجن تیرے سر پر پاپ کی گٹھری رکھی ہے راہ اندھیری ہے۔ منزل کٹھن ہے۔ پھر کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ:

کرلے جتن سندگار ساجن پیا ملن کو جانا

(حریت ۲۸ دسمبر ۱۹۷۰ء)

نراشا کب تک؟

(۱۷)

رین اندھیری، چھائی بدریا کاری۔ پاپ کی گٹھری سر پر۔ راہ کٹھن۔ منزل دور۔ زندگی کے مسافر کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔

آشا والے پربھو! نراشا کب تک؟

شہ رگ سے قریب رہنے والے بھگوان! تیرا داس نراشا کے بھنور میں پھنس گیا ہے۔ داتا اس کو ڈوبنے سے بچا، اور اس کی آشا نہ توڑ۔

بجلی کی کڑک۔ شرارے کی چمک۔ جگنو کی دمک۔ نینن کی جوت میں چمکنے والے جوتی سروپ! نراشا کی دلدل سے نکال کہ تیرا غلام سب سے مایوس ہو کر تجھ کو اور صرف تجھ ہی کو پکارتا ہے کہ تیرے در سے کوئی بھکاری خالی نہیں جاتا۔

بھگت کے بس میں آنے والے بھگوان! اندھیاری میں اجیاری دکھانے والے وحدہٗ لاشریک، ست سری اکال۔ ایکو برہم دوتیو ناستی کا رُوپ دھارن کرنے والے رحمٰن، اپنے بھگت کو نراشا کے اندھیارے میں ٹھوکریں کھانے سے بچا۔ اور آشا کا

اُجالا دکھا۔

نمرودی جہنم کو گلزار بنانے والے داتا! بھگتوں کی رکشا کرنے والے مولیٰ مایوسی کے دریا میں غوطے کھانے والے کو بچا۔

آشا والے پربھو! نراشا کب تک؟

حریت ۲ جنوری ۴۳ء

جیون نیّا ڈگ مگ ڈولے!

(۱۸)

ہردے کا پنچھی بولے، جیون نیّا ڈگ مگ ڈولے ساجن، جیون نیا ڈگ مگ ڈولے۔

قفس کا قیدی، آزادی چاہتا ہے۔ پرانتو شریر کے پنجرے سے سر پھوڑ کر ناک ٹک دیکھتا ہے۔ اور مایوس ہو کر پکارتا ہے۔ جیون نیّا پار لگانے والے داتا، جیون نیا پار لگا۔

جیون نیّا ڈگ مگ ڈولے!

رین اندھیری، چھائی بدریا کاری، جیا دھڑکت ہے۔ زندگی کی ناؤ پاپ کے ساگر میں، بھنور کے چکّر میں، پھنس گئی نیا سکھی ری۔

جیون نیا ڈگ مگ ڈولے!

راہ کٹھن، کنارا دور، ملّاح کے بازو شل ہیں۔ چپّو پہ ہاتھ اوچھا پڑ رہا ہے کشتی کا تختہ ٹوٹ چکا۔ بادبان گر گیا ساجن۔

جیون نیا ڈگ مگ ڈولے!

طوفانی موجیں نیّا کے ٹوٹے پھوٹے تختوں سے ٹکراتی ہیں ملاح سلامتی سے کنارے پہونچنے سے مایوس ہو چکا ہے کشتی کے بچنے کی ساری امیدیں ٹوٹ گئیں۔ مسافروں میں ہل چل ہے۔ نراشا کے اندھیارے میں آشا کا چمتکار دکھا، بھگوان!

جیون نیّا ڈگ مگ ڈولے!

گوتم بدھ کے متّیا میں۔ رام کے اچھوت بھوجن میں۔ مہا بھارت کی رَن بھومی میں۔ یوسفؑ کے زندان میں، نمرود کے جہنّم میں کنس کے انیائے میں۔ فرعون کی سفاکی۔ موسیٰؑ کے چرواہے میں۔ عیسیٰؑ کی صلیب میں۔ قریش کی درندگی میں۔ بدر کے میدانِ جنگ میں نظر نہ آنے والے بھگوان!

جیون نیّا ڈگ مگ ڈولے!

جنگل بیابان میں، ویران سنسان میں، تجھ کو پکارتا ہوں۔ داتا بچا۔ مولا بچا، آقا بچا۔ ارے بچالے کہ

جیون نیّا ڈگ مگ ڈولے!

حریت ۱۶ جنوری ۴۲ء

پی ہو کی بولی بول پپیہے!

(۱۹)

پی ہو کی بولی بول پپیہے! پی ہو کی بولی بول پیارے پپیہے!
جس کے میٹھے بولوں نے جانی دشمنوں کو جان نثار دوست بنا دیا
اُسی

پی ہو کی بولی بول پپیہے!
جس سچائی کے اوتار نے پشتوں کے دشمنوں کو غم گسار اور جاں نثار بھائی بنایا۔ اُسی

پی ہو کی بولی بول پپیہے!
جس کے رس بھرے نیناں نے فرزانوں کو دیوانہ بنایا۔ اُسی

پی ہو کی بولی بول پپیہے!
جس کی بولی نے سفّاکوں کو رحم دل، ڈاکوؤں کو انسانیت نواز
بادیہ نشینوں کو تاجدار بنا دیا۔ اُسی

پی ہو کی بولی بول پپیہے!
جس نے غلامی کا نام و نشان مٹا کر پستوں کو بلند کیا۔ سامراج
کو نیست و نابود کیا، حقیقی مساوات، سچی حریت پیدا کی۔ اُسی

پی ہو کی بولی بول پپیہے!

اور کچھ اس انداز سے بول کہ مسلمان بیدار ہو۔ اس کو بھولا ہوا سبق یاد آئے۔ محکومی کی زنجیریں توڑنے میں وہ سب سے آگے ہو کر پی کے کسی بول سے غلامی کی تائید نہیں ہوتی۔ پیارے پپیہے نہیں ہوتی

پی ہو کی بولی بول پپیہے!

حریت ۲۳ جنوری ۴۶ء

نینن جل برسائے سجنی!

(۱۹)

پیا بن چین نہ آئے سجنی، پیا بن جیا تڑپے، پیا کے درشن کو انکھیاں ترسیں پیا ملن کی آشا میں۔

نینن جل برسائے سجنی!

راہ کٹھن، منزل دور، مسافر تھک کر ہو گیا چکنا چُور، سکھی ری، مسافر بیٹھا آس لگائے۔

نینن جل برسائے سجنی!

پاپ کی گٹھری سیس دھری، پیا کے دربار میں جائے لجّا آئے، پیتم کے حضور پیروں میں لرزا آئے، سکھی ری۔

نینن جل برسائے سجنی!

پی کے دوارے چلوں، پی کے در پہ سیس دھروں، پی کی منتی کروں، پی بن موہے کل نہ آئے، سکھی ری۔

نینن جل برسائے سجنی!

پی کی داسی، پی کے درشن کی ابھلاشی، ہردے کے سانس سے، خون کے ہر قطرہ سے، ریت کے ہر ذرّے سے پی پی کی صدا آئے سجنی۔

نینن جل برسائے سجنی!

نینن میں جلوا کس کا، ہردے میں بیٹھا کون برمائے، من مندر میں پی سمائے، مندر کے پٹ کھول پجاری۔

نینن جل برسائے سجنی!

گوتم کے نروان میں۔ رام کے بن باس میں۔ کرشن کے چکر میں موسیٰ کے عصا میں۔ کنعان کے زندان میں مسیحؑ کی سولی میں۔ حرا کی گپھا میں، کون سمائے؟

نینن جل برسائے سجنی!

پی کا جلوہ، مجھ پاپن کو، مجھ برہن کو۔ مجھ دکھیا کو، مجھ ابھاگن کو، پی کا مکھڑا کون دکھائے سکھی ری۔

نینن جل برسائے سجنی!

مندر کس کا، گرجا کس کا۔ کعبہ کس کا۔ شوالہ کس کا، گوردوارہ کس کا پاپ کپٹ میں کچھ نظر نہ آئے۔ دیر و حرم کے جھگڑے کون چکائے۔

نینن جل برسائے سجنی!

یہ ہندوستان جنّت نشان۔ پرہیزگاروں کا وطن، کب تک رہے غلام بھارت کی لاج تمرسے ہاتھ بھگوان۔

نینن جل برسائے سجنی!

بیکسی کی مورت، بے بسی کی صورت، غلامی کی لعنت۔ نااتفاقی کی کوڑھ، ہٹ دھرمی کا پلیگ۔ ان روگوں سے، دلیش ہمارا کب چھٹکارا پائے۔

نینن جل برسائے سجنی! نینن جل برسائے سجنی!

من ہے ڈانواں ڈول ساجن!

من ہے ڈانواں ڈول

(۲۱)

من کی کھوٹ مٹا ساجن، من کی کپٹ مٹا ساجن، پاپ کی کالک
گرد دور ساجن، سور یہ دیوتا پر موت کی وردی چھائی ساجن!
من ہے ڈانواں ڈول ساجن
من کی پھلواری سوکھی۔ کوئلیا کوک رہی۔ دل کی دنیا ڈولے پریم
پون سے دل کی کلی کھلی، من کی بپتا بول، ساجن!
من ہے ڈانواں ڈول ساجن
جیون ہے ایک سپنا، من کا پنچھی ڈولے ساجن، من ہیں بسے پریتم،
من پیتم کا، دھن پیتم کا، بل کا ہے مول، ساجن!
من ہے ڈانواں ڈول ساجن
پریتم آئے، من کی بگیا میں آئی بہار، بہار ساجن، کلی کلی مسکائے
شبنم منھ دھلائے، غنچہ بل بل جائے ری، ساجن
من ہے ڈانواں ڈول ساجن
من کا ہے کو ڈولے، من کا پنچھی بولے۔ من ہے پی کے بس ہیں.

پی کہت، پی کہت، باورا پپیہا مرمر جائے، ساجن!

من ہے ڈانواں ڈول ساجن

پاپ کے ساگر میں، بیچ بھنور میں، نیا ڈوبت ہے۔ پتوار گئے ٹوٹ ساجن!

من ہے ڈانواں ڈول ساجن

رین اندھیری، بجلی چمکے۔ جیا دھڑکے، جاتا۔ کی کھرچن راہ دکھائے۔ ہردے کی کالک کون مٹائے۔ ساجن!

من ہے ڈانواں ڈول ساجن

پاپ نگر میں، پی کی بولی کون سنائے۔ ساجن کو بھلائے۔ اس سنسار میں سکھی رہی، پی کو جگت بھلائے ساجن!

من ہے ڈانواں ڈول ساجن!

من ہے ڈانواں ڈول

حریت ۶ فروری ۱۹۴۷ء

پی کہاں؟

(۲۴)

پی کہاں، پی کہاں، کی دردناک آواز سے دل کو برمانے والے بیکس و مظلوم پپیہے!
پنجرے میں اسیر ہو کر قفس کی تیلیوں سے پھڑپھڑا کر تو چلا رہا ہے کہ پی کہاں؟
عالم لاہوت سے ناسوت میں آ۔ آنکھیں بند۔ لب بند۔ جگر بند ہوں تو معلوم ہو کہ پی کہاں؟
پی وہاں، جہاں انسانی تخیل کی انتہا ہے۔ پی وہاں جہاں انسان کی شہ رگ ہے۔ پی وہاں جہاں انسان کی شہ رگ ہے۔ پی وہاں جہاں قوتِ تخیلہ جواب دے دیتی ہے۔ پی وہاں جہاں فلسفی کا فلسفہ لاجواب ہے
پی ہمالیہ کے سر بفلک، برف پوش پہاڑوں میں۔ پی حجاز کے لق و دق ریگ زاروں میں۔ پی کشمیر کے سرسبز مرغزاروں میں۔ پی آندھی کے بگولوں میں۔ پی بجلی کی کڑک میں، پی شیر کی گرج میں، پی کوئل کی کوک میں
پی سنسان ویرانوں میں، پی آبادیوں کے جنگلوں میں۔ پی امیروں کے

عشرت کدوں میں، پی غریبوں کے جھونپڑوں میں، پی پتھر کے جگر سے پھوٹنے والے چشموں کی روانی میں۔ پی سمندر کی بیقرار لہروں میں، اور پھر بھی تو چلّا رہا ہے کہ پی کہاں؟

پی کہاں؟ پی کہاں؟ کا شور مچا کر اپنی بے چینی اور بیکسی پر متوجہ کرنے والے،

پپیہے یہ بتا کہ پی کہاں نہیں؟

پی تجھ میں۔ پی مجھ میں، پی اس کے پاس جو اُس کو پکارے۔ پی مریض کی آہ میں، پی کمزور کی بے کسی میں۔ پی محکوم کی ذلّت میں، پی ساحر کی عیاری میں۔ غرضکہ وہ ذات واجب الوجود ہر جگہ موجود۔ پھر

مجھے بتا کہ پی کہاں نہیں؟

پی کے واسطے پی پی کی رٹ نہ لگا۔ پی نے اگر اپنی ہلکی سی جھلک دکھادی تو یہ عالم تہ و بالا ہو جائے گا اور تو پھر یہ رٹ لگانی بھول جائے گا کہ

پی کہاں؟

(حریت ۱۳ فروری ۱۹۲۸ء)

مستقبل کی دعاؤں کا انجام

(۲۴)

تم جب دعا مانگتے ہو کہ خدایا میری تقصیرات کو بخش دے۔ مجھے اُخروی نیکیاں عطا کر۔ یا جب تم یہ دعا مانگتے ہو کہ خدایا مجھے دنیا میں نیکوکاری کی توفیق دے تو یہ دعا بالکل بجا اور درست ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ دعا مانگتے ہو کہ خداوندا مجھے کروڑپتی بنا دے یا مجھے ہفت اقلیم کی بادشاہی عطا کر۔ یا کم از کم میں جس حالت میں ہوں اس سے بہتر حالت میں کر دے تو گویا تم ایک ایسی چیز مانگتے ہو جس کی بُرائی بھلائی کے متعلق تمہیں خود کچھ علم نہیں۔ اور اس لئے اس دعا کی اور اس قسم کی دعاؤں کے قبول نہ ہونے پر تمہارا رنجیدہ ہونا بالکل نادانی پر مبنی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ دولت تمہارے لئے مفید ہے یا مضر ہے۔ فرض کرو کہ ایک شخص غربت کی حالت میں نہایت پرسکون زندگی بسر کرتا ہے۔ ہر شخص کو اس کے ساتھ ہمدردی ہے۔ دنیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں۔ وہ اندھیرے اُجالے بے تکلّف جہاں چاہتا ہے جاتا ہے۔ وہ ہر کس و ناکس سے بے دھڑک ملاقات کرتا ہے۔ رات کو جب وہ سوتا ہے تو اُسے اپنے جان و مال کے متعلق کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ لیکن دولت مند بنجانے

کے بعد اُسی کے خاندان میں چند خودغرض لوگ، جن کو اُس کی دولت میں سے حصہ ملنے والا ہے اُس کے دشمن اور خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ وہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور جب موقع ملجاتا ہے تو وہ اُسپر قاتلانہ حملہ کرتے ہیں۔ مقتول سے اُس وقت جب وہ دم توڑ رہا ہو کوئی پوچھے کہ افلاس کی پُرسکون زندگی بہتر ہے یا تمول کی پُرآشوب زندگی تو جواب میں جو کچھ وہ کہے گا اُس کا ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص مفلسی اور تنگدستی میں خانہ نشین ہو کر زندگی بسر کر رہا ہے لیکن یکایک اُسے دولت مل جاتی ہے۔ دولت آتے ہی اُس کے خیالات میں تغیر پیدا کر دیتی ہے۔ وہ بے تکلف شراب پیتا ہے۔ کھلم کھلا سیاہ کاری کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ سیاہ کاری کے سلسلہ میں وہ اپنے رقیب کو قتل کر دیتا ہے تحقیقات ہوتی ہے۔ دولت کا بڑا حصہ مقدمہ کی پیروی میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ لیکن آخر کار پھانسی کا حکم ہوتا ہے۔ پھانسی کے تختہ پر اُس سے دریافت کرو کہ افلاس اچھا ہے یا دولت مندی تو وہ مسلسل آنسوؤں سے یہی جواب دے گا کہ افلاس بہتر ہے۔

پس ان مثالوں کو پیش نظر رکھ کر اپنی حالت میں خوش رہنا چاہیئے اور اگر دل کی تمنائیں پوری نہ ہوں تو یہ سمجھکر کہ ان کا پورا نہ ہونا ہی بہتر تھا رنجیدہ نہ ہونا چاہیئے۔ کہ تم مستقبل کی دعاؤں کے انجام سے بے خبر ہو۔

حریت ۲۶ مارچ ۱۹۲۲ء

کائنات کی حقیقت

(۴۲)

رات کے سناٹے میں جب کہ ساری دنیا بے خبر ہوتی ہے اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ ساکن ہوتا ہے، میں مضطربانہ انداز سے آسمان پر نظر ڈالتا ہوں۔ شب تنہائی کے مونس چھوٹے چھوٹے تارے آسمان پر چمکتے نظر آتے ہیں۔ شاعر اسے حسنِ مطلق کے ماتھے کی گری ہوئی افشاں یا چاندی کی گھر چن کہتے ہیں۔ دانش مندانِ سائنس کے نزدیک یہ آگ کے گولے ہیں جو فضائے آسمانی میں تیزی سے لڑھک رہے ہیں۔ ان کی رفتار پر غور کیا جائے تو سر چکراتا ہے۔ ان کے حجم کے تخیل سے تصور معذور رہے۔ میشلہ ارتقار کا نوجوان مبتدی کہتا ہے کہ یہ دنیا بھی ایک سحاب ہے۔ وہ خوش ہے کہ اس نے کائنات کی حقیقت دریافت کرلی۔ مگر کیا یہ سچ ہے؟ اور کیا کائنات کی حقیقت پر آج تک کوئی عبور حاصل کر سکا ہے؟

نیند اور میٹھی نیند قدرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جس کی کوئی قیمت

نہیں۔ قدرت کا یہ فیض اس قدر عام ہے کہ ہفت اقلیم کا بادشاہ، ایک مزدور۔ ایک فیلسوف۔ اور ایک گدا گر سب ہی اس سے مساویانہ حیثیت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

جب ایک غریب کسان دن بھر کی محنت کے بعد تھک کر چکنا چور ہو جاتا ہے۔ جب ایک مزدور کو دن بھر کی محنت کے بعد اس کے ہاتھ پیر جواب دے دیتے ہیں۔ جب ایک فلاسفر کا دماغ تھک جاتا ہے، جب ایک بادشاہ دن بھر اپنی قلمرو کے انتظامات کے بعد سکون کا متلاشی ہوتا ہے۔ جب ایک سپاہی کے دست و بازو تلوار چلانے سے جواب دے دیتے ہیں تو اُس وقت کائنات کا پیدا کرنے والا خدا نیند کا پیام بھیج کر سب کلفتوں کو دُور کر دیتا ہے۔ غور کرو کہ اگر اس نیند اور صرف نیند کے عطیہ سے قدرت تم کو محروم کر دے یا کوئی ایسا ٹیکس لگا دے جو تمہارے لئے ناقابلِ برداشت ہو تو بتاؤ کہ اس نیند کو حاصل کرنے کے لئے تمہارے پاس اس دُورِ مادیت میں کونسی طاقت ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس کارساز عالم سے سوائے اظہارِ عجز کے اور اپنی بیچارگی اور بندگی کے اعتراف کے کوئی صورت اس بے حقیقت لطف و عطا کے حصول کی نظر نہیں آتی۔ پھر کیا قدرت کے دوسرے عطایا کا یہی حال نہیں ہے؟

نادان انسان، کم فہم انسان خوش ہے کہ اس نے آہنی

ڈریڈناٹ بنا کر حوادثِ سمندر سے نجات حاصل کرلی۔

مگر کیا تم نے نہیں سنا کہ مادیت کے یہ پرستار جس وقت اپنے ظاہری اسباب پر بھروسہ کر کے اس زندہ اور طاقتور خدا کی غیبی طاقتوں سے انکار کر کے اس آہنی قلعہ کو آگ اور دھوئیں کے بھروسہ پر سمندر میں ڈالتے ہیں تو اُس وقت ان کو بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ جس طاقت سے یہ آہنی قلعہ سمندر کے سینہ کو چیرتا ہوا اپنی منزلِ مقصود پر جا رہا ہے اس طاقت کو سمندر کا ایک مرغ ان دیکھے خدا کے حکم سے ایک لمحہ میں فنا کر دیتا ہے۔ طوفان خیز سمندر کی موجیں اس قلعہ کو ایک کھلونا بنا دیتی ہیں۔ اور آخری ہچکی میں سمندر کا پانی جہاز کے اندرونی حصہ میں آہنی چادروں اور شہتیروں کو توڑتا ہوا پہنچ جاتا ہے۔ اس طرف جبکہ ایک طرف ساحل دُور سے نظر آتا ہے اور دوسری جانب طوفان کے ہلاکت آفریں ہچکولے پیامِ موت بن کر سامنے آتے ہیں، تو پھر یہ مادہ پرست انسان اس خدا کے آگے جھک جاتا ہے جس کی حکومت سے اور غلامی سے کسی کرہ کے کسی ذی رُوح کو مفر نہیں۔

تم باغ میں چہل قدمی کر رہے ہو۔ گلاب کے شاداب پھول کو دیکھ کر تمہاری رُوح میں بالیدگی پیدا ہو رہی ہے۔ یکایک ایک بھونرا آتا ہے اور پروانہ وار پھول کے گرد چکر کاٹتا ہے۔ کبھی تڑپ کر گلاب کے پھول کو کلیجہ سے لگاتا ہے۔ اور کبھی اُڑ کر رقص کرتا ہوا دُور سے محوِ نظارہ ہوتا ہے۔

کچھ سمجھے یہ غیر دلچسپ نظارہ قدرت کے منشاء کو کس طرح پورا کرتا ہے ؟
یہ کالی صورت والا بھونرا جس وقت ایک پھول کا رس چوس کر دوسرے پھول پر اُڑ کر جاتا ہے تو پھول کے جگر میں سے ایک مادہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور یہ مادہ دوسرے پھول میں پہونچ کر بیج پیدا کرتا ہے اور اس طرح قدرت کا منشاء تخلیق پورا ہوتا ہے۔ کاش انسان ایک لمحہ کے لئے اپنی پر غور کرے۔

(حریت ۲ اپریل ۱۹۳۴ء)

مشاہداتِ قدرت

(۲۵)

جس وقت تم اپنے کسی دوست سے اپنی غلطی کی وجہ سے ناراض ہوتے ہو تو دنیا کی تمام بُرائیاں تم کو اس میں نظر آتی ہیں اور تم کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ابھی ان حرفوں کی سیاہی بھی خشک نہ ہوئی ہو گی۔ جن میں اپنے اس مغضوب دوست کی تعریف کر چکے ہو۔ کاش تم نے ناراض ہونے سے پہلے اس پر غور کیا ہوتا کہ دنیا نے تمہارے تلون کے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی۔

جو شخص اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا عادی ہو اس کو تم نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھو گے۔ کہ وہ نہایت بے حیائی سے اپنی تعریف خود کرتا ہے اور اس کی اس حرکت کو تکبر اور غرور سے تشبیہہ دو گے۔

مگر اس شخص کی ہر سمجھدار اور ناسمجھ انسان تعریف کرتا ہے۔ جو چند الفاظ اپنی لغزشوں کے متعلق ازبر کر لیتا ہے اور کھلے بندوں اپنے گناہ اپنی قابلیت اور اپنی دلیری، ہمدردی اور اپنی سخاوت، اپنے علم و فضل اور زہد و تقدس کا اعلان کرتا ہے۔ مگر اس کے عجز و غرور کا نام عقلمندوں نے "انکسار" رکھا ہے۔ حالانکہ نتائج کے اعتبار سے دونوں

خود بین۔ خود پرست، خود غرض۔ شہرت طلب ہیں۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ ایک بے وقوف اور دوسرا عیار ہے۔ ایک دھوکہ باز ہے۔ دوسرا اس کی اہلیت نہیں رکھتا۔ پھر کیا دنیا نے دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھا ہے؟

(۴)

تم باغ میں چہل قدمی کر رہے ہو۔ ناگاہ تمہاری نظر ایک گلاب کے سرسبز اور شاداب اور روح پرور نخلے پر پڑی۔ معاً تم اس جنت نشان خطے کی طرف لپکے اور ایک خوش نما گلاب کے پھول کو اپنے دماغ کو معطر کرلے کے لئے توڑا۔ ابھی گُل شاخ سے علیحدہ بھی نہیں ہوا تھا کہ تمہاری چٹکی میں کانٹے چبھ گئے۔ دامنوں نے اُلجھ کر تمہاری مسرت کو پریشانی سے تبدیل کر دیا۔ کاش تم نے گُل چینی کے وقت کانٹوں کا بھی خیال رکھا ہوتا؟

اگر تم غور کرو تو ہر خیر کے ساتھ شر کا ہونا لازمی ہے۔ اور جس طرح یہ ممکن ہے کہ تم بغیر کانٹوں میں اُلجھے گلاب کا پھول توڑ کر اپنے دماغ کو معطر کرسکتے ہو، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ تم شر میں سے صرف خیر کو اختیار کرو۔

(۵)

تم بہت طاقتور ہو۔ اور اُس کے ساتھ جنگجو بھی ہو۔ تم نے اپنی طاقت اور جنگجوئی کے بار بار مظاہرے بھی کئے ہیں۔ اکثر محلہ والے۔ گاؤں والے بستی والے تمہاری مردم آزاری سے ڈر کر تم کو دیکھتے ہی سلام بھی کرلیتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ تم اپنی عادت کی وجہ سے ہر اُس

شخص سے انتقام لے سکتے ہو جو تمہارے ارادے میں ذرا بھی مداخلت کرے۔

مگر جس وقت تم کمزوروں مظلوموں، بےکسوں پر ظلم کرتے ہو۔ اگر اس وقت یہ بھی غور کرلو کہ اس دُنیا میں تم سے بہت زیادہ ظالم وجابر آئے تھے جنھوں نے اپنی سفاکی اور بیدردی اور خونریزی کی ایک تاریخ چھوڑی ہے۔ ان میں یزید۔ شمر۔ ابن زیاد۔ حجاج۔ ہلاکو۔ چنگیز۔ کنس۔ بھی تھے۔ مگر ان پر بھی ایک ایسا وقت آیا ہے کہ انھوں نے عقل وخرد سے کام لیا ہے۔ اور ان کا سر نیاز اس بلند وبرتر ہستی کے آگے جھکا ہے جسکے قبضہ میں کائنات کا خیر وشر ہے۔ پھر اگر تم ایک لمحہ کے لئے رات کے آخری حصہ میں تضرع وزاری کے ساتھ جھک جاؤ تو تم کو ایسی لذت حاصل ہوگی کہ تم ساری عمر کے لئے اپنی مردم آزاری سے توبہ کروگے۔ تم کو میرے اس دعوے میں اگر کچھ شک ہے تو آج ہی تجربہ کرو۔

(۴)

تم جوان ہو۔ چہرہ پر چار چاند خون ہے۔ اعضا متناسب ہیں۔ عیش کے سامان مہیا کرنے کے لئے جیب میں سنہری اور روپہلی سکے بھی ہیں۔ ہر حکم کی تعمیل کے لئے دست بستہ خدام حاضر ہیں۔ اس حالت میں تم سے ایک حسین ترین دوشیزہ نے آلودہ معصیت ہونے کے لئے شب چہاردہم میں ملنے کا وعدہ کیا۔ تم نے اُس کے وعدے پر اعتماد کیا۔ عیش کے تمام اسباب مہیا کئے۔ رات کا ابتدائی اور انتہائی حصہ اس حسین عورت کے

انتظار میں گزرا۔ مگر وہ نہ آئی اور تمہاری برہمی انتہا کو پہونچ گئی۔ اگر اس وقت تم یہ بھی غور کر لو کہ تم نے بھی اپنے پید۔ا کرنے والے سے کوئی عہد کیا تھا۔ جو آج تک پورا نہیں ہوا۔ اگر وہ بھی تم سے برہم ہو جائے تو کیا تم نے اس کے غضب سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ تلاش کر لی ہے؟

حریت ۹۔ اپریل ۱۹۴۰ء

زندگی کے تین رُخ!

(۲۶)

تم اپنے دوستوں میں بیٹھے ہوئے ڈینگیں مارتے ہو کہ اگر خدا مجھے مالدار کر دے تو میں یتیموں کی پرورش کروں۔ محتاجوں کو خیرات دوں۔ بیواؤں کے لئے وظائف مقرر کروں۔ غرباء کی تعلیم کے لئے اسکول کھول دوں۔ اور اگر فراغت اور اطمینان کی زندگی میسر آئے تو اپنا تمام وقت طاعتِ الٰہی میں بسر کر دوں۔ میری دلی دعائیں تمہارے ان پاک ارادوں کے ساتھ ہیں۔

مگر کیا مجھے بتا سکتے ہو کہ جو آسائشیں تم کو اس وقت حاصل ہیں ان سے تم نے بنی نوع انسان کی کیا خدمت کی۔

میرے اس سوال کا جواب تمہارے پاس یقیناً یہی ہو گا کہ نہیں۔ تو پھر کس بنیاد پر تم یہ دعوے کرتے ہو کہ فراخ دستی اور سکونِ قلب حاصل ہوتے ہی تم اپنے میں فرشتوں کی سی صفتیں پیدا کر لوگے۔ یقیناً تمہارا یہ دعوے تم کو خود دھوکے میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔

(۲)

تم کو شیطان لعین نے اس گمراہی اور ضلالت میں مبتلا کر دیا ہے۔

کہ قدرت نے تم کو اپنے نعائم سے خصوصیت سے محروم رکھا ہے۔ اس لئے تم اکثر کہا کرتے ہو کہ میں غریب ہوں۔ مجھے افلاس نے گھیر لیا ہے۔ لہٰذا میری بسر اوقات اچھی طرح نہیں ہوتی۔

یورپ نے اگر کوئی ایسی دُوربین ایجاد کی ہوتی جو دلوں کے بھید بتا سکتی تو میں تم کو مشاہدہ کرا دیتا کہ تم ان کروڑوں سرمایہ داروں سے بہتر زندگی بسر کر رہے ہو جو تمہارے خیال میں مفلس نہیں ہیں۔ کیونکہ اُنمیں سے کوئی سکونِ قلب کے افلاس میں مبتلا ہے اور کوئی اپنے معاصرین کی رفتار ترقی کے حسد کے مرض کا مریض اور پھر کوئی کارخانہ دار اپنے کاری گروں کی بغاوت کے اندیشہ سے گھلا جاتا ہے۔ تو کسی سرمایہ دار کو یہ خوف ہے کہ اس کو کوئی زہر دے کر جسم و روح کا تعلق منقطع نہ کر دے کوئی بادشاہ اپنی ہمسایہ سلطنت کی ترقی کو اپنے لئے باعثِ تنزل سمجھتا ہے تو کوئی شریف اپنے پاجی دوستوں کی رذالت سے نالاں ہے۔ غرضکہ تم پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں، قبیلوں، دیہاتوں، شہروں میں جہاں چاہو چلے جاؤ۔ تم کو اپنے سے کروڑوں بدتر انسانوں سے واسطہ پڑیگا اور اُس وقت تم کو معلوم ہوگا کہ قدرت نے اپنی بہترین پیداوار کے خزانے تم پر کھول دیئے ہیں۔ پھر کیا تم خداوند قدوس کے نعم و فضل کا شکر ادا نہ کرو گے؟

(۳۳)

جس وقت تم اپنے پیارے بچے کے لئے ریشمی اور زرکار لباس تیار

کراتے ہو جس وقت تم اپنے دستر خوان پر بہترین اور لذیذ کھانے چنتے ہو کیا تم کو بھول کر بھی یہ خیال آتا ہے کہ تمہارے گھر میں ایک دیوار بیچ تمہارا غریب پڑوسی اور اس کا معصوم بچہ ایسے اچھے کھانے اور نفیس لباس کے لئے ترس رہا ہے۔ اور کیا تم یہ سوچنے کی تکلیف گوارا کرتے ہو کہ تمہارے کنبہ میں. تمہارے عزیز ترین عزیزوں میں ایسے بہت سے ہونگے جو نیم برہنہ ہونے اور فاقہ کشی کی لعنت میں مبتلا ہونے کے باوجود تمہارے بھائی ہیں۔ اور شاید تم کو معلوم ہو کہ خدائے عزوجل نے حقوق اعزا اور ہمسایہ کے متعلق قرآن کریم کے ذریعہ تمہیں مطلع بھی کر دیا ہے۔ پھر کیا اس سبق کو جو تم بھول گئے ہو۔ میں دوہراؤں ؟

(حریت ۱۶۔ اپریل ۱۹۳۸ء)

تمہاری زندگی کی حقیقی تصویر!

(۲۷)

تم کو اس کا بڑا خوف ہے کہ اگر تمہاری زندگی کی اصلی تصویر دنیا کے سامنے آجائے تو تمہاری بدنامی اور رسوائی اور ذلّت وخواری میں کچھ کسر باقی نہیں رہے گی۔ تم اس تصور سے لرزاں ہو کہ تمہارے مصنوعی تقدس کے تار و پود اگر بکھر گئے تو حلقۂ معتقدین و مریدین میں نہ صرف ہلچل پیدا ہوگی بلکہ اس کا اثر تمہاری معاش پر بھی پڑے گا۔ اور جو سنہری ٹکلیاں تم اپنے مصنوعی تقدس کے خراج میں وصول کر کے بے وقوفوں کی جہالت کی بدولت عیش و عشرت میں مصروف ہوتے ہو وہ بھی بند ہو کر تمہارے تموّل کو افلاس میں تبدیل کر دے گا۔

اگر تم صفائی قلب کے ساتھ اور عزم صمیم کے ساتھ یہ طے کر لو کہ تم دھوکہ نہ دو گے تو پھر نہ تم کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ دنیا کی کوئی طاقت تم کو مرعوب کر سکتی ہے۔ اور یہی اسلامی تعلیم کا خلاصہ ہے۔

(۲)

جب تم تمام دن کی محنت و مشقت کے بعد اپنے گھر آؤ اور خواب راحت کے مزے لینے کے لئے تم بستر پر دراز ہونا چاہو تو اس وقت

یہ بھی غور کرو کہ تم نے آج کتنے اچھے کام کئے اور کتنے بُرے۔ کتنے کمزوروں پر ظلم کیا، اور کتنے طاقتوروں کا ظلم سہا۔ کتنے انسانوں کی دل آزاری کی اور کتنے خدا کے بندوں کی دلدہی کی۔ کتنے الفاظ زبان سے ایسے نکلے جن پر خود عمل کیا۔ اور کتنے الفاظ ایسے تھے جن کے خلاف معروف عمل ہوئے۔ اگر تم ایک مہینہ تک اس پر عمل کر لو تو میں خود ذمہ دار ہوں کہ تمہاری زندگی میں انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ اور تم صحیح معنوں میں اسلام کے پیرو ہو جاؤ گے۔ اور تمہاری زندگی دوسروں کے لئے قابل تقلید زندگی ہو جائے گی۔ اور خود تمہارے لئے بھی فوز و فلاح کا باعث ہوگی۔

(۳۷)

تم روزانہ مشاہدہ کرتے ہو کہ آفتاب طلوع ہوتا ہے، اور غروب ہو جاتا ہے۔ بچے پیدا ہوتے ہیں اور بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ پھول کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں۔ بیج اُگتا ہے اور پروان چڑھ کر سرسبز درخت خزاں کے ہاتھوں پامال ہوتا ہے۔ اور فلسفۂ زوال کا یہ عینی مشاہدہ تم کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔

پھر کیا تم نے اپنی زندگی کے پروگرام میں فلسفۂ زوال کے اسباب کو بھی شامل کر لیا ہے؟ اگر تم ایک لمحہ کے لئے یہ غور کر لو کہ اک روز تم کو بھی فنا ہونا ہے۔ اور دنیا کے یہ دلفریب جلوے بھی ختم ہوں گے تو یقین جانو کہ تم اپنی زندگی کا مقصد پا جاؤ گے۔ اور ایک منٹ بھی تمہارا دل اس دنیا کی خوش نمائی کے جال میں نہ اُلجھے گا۔ اور دنیا طلبی میں تم کتنوں

کی طرح دُم ہلاتے ہوئے غیر اللہ کے پیروں پر نہ لوٹو گے کہ اسلام کی حقیقی رُوح یہی ہے۔

(۴)

جس ذوق سے تم ایک حسین ترین عورت کا چہرہ دیکھتے ہو اور اُس کے حصول میں کوشاں ہوتے ہو، جس شوق سے تم گانا سنکر اپنی روح کو دعوت نشاط دیتے ہو اور جس محویت کے ساتھ تم شطرنج۔ چوسر تاش۔ فٹ بال۔ کرکٹ ٹینس وغیرہ کھیل کھیلتے ہو اس کا اگر چوتھائی حصہ بھی استغراق اور محویت کے ساتھ مولائے کائنات کے آگے رات کی تاریکی میں، صبح کے سنّاٹے میں ایک مرتبہ بھی جھک جاؤ تو یقین جانو کہ تم کو وہ راحت اور خوشی حاصل ہوگی جو حسین عورت کے حصول میں گانے کے رُوح نواز نغمہ میں اور کسی مغربی یا مشرقی کھیل میں حاصل نہ ہوگی، پھر کیا سالہا سال کے لہو ولعب کے بعد چند منٹ کے لئے خدائے قدوس کے آگے اخلاص و انکساری کی پیشانی جھکا کر میرے اس دعوے کی تصدیق کرو گے؟

(حریت ۲۲۔اپریل ۱۹۴۸ء)

کیا تم مسلمان ہو؟

(۲۸)

تم ایک کام کا ارادہ کرتے ہو۔ پہلے یہ سوچتے ہو کہ یہ کام مجھ کو کرنا چاہیئے یا نہیں؟ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے تو پھر تم غور کرتے ہو کہ اس کام کو کس طریقے سے کرنا چاہیئے۔ جب اس منزل سے بھی گزر جاتے ہو تو کام کی ابتدا کرتے ہو۔ ابتدائی مشکلات تم کو قدم قدم پر ٹھوکریں کھلاتی ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم اپنے پیشِ نظر مقصد میں کامیاب ہوتے ہو۔ ورنہ ناکامی کا منحوس سایہ تم پر پڑتا ہے اور تمہارے اغراض کی پائمالی، تمہاری آرزوؤں کا خون۔ تم کو مایوسی کے قعرِ مذلت میں ڈبو دیتی ہے۔

مگر کیا تم نے ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی غور کیا ہے کہ یہ کائنات اور کائنات کا ہر ذرہ ایک لفظ کُن سے کیونکر عالمِ وجود میں آیا۔ اور ایک دن اسی کُن کہنے والے کے حکم سے یہ سارا کارخانہ نابود ہو جائے گا۔ پس کیا ایسے وقت کے لئے تم نے کوئی تیاری کرلی ہے؟ اگر تم مسلمان ہو تو تم کو زندگی کے اس وقفہ میں سفرِ آخرت کے لئے زادِ راہ تیار کرنا پڑے گا۔

جب تم مسلمان بچوں کو اسلامی آبادی کی گلیوں میں مسلمانوں کے محلوں میں گالیاں دیتے۔ پتنگ بازی کرتے۔ بٹیر بازی اور کبوتر بازی بازی اور مینڈھے بازی اور تیتر بازی ہ فحش گالیاں بکتے۔ فحش مذاق کرتے۔ فحش گیت گانے وغیرہ میں مصروف دیکھتے ہو تو کیا تم اس کو بھول جاتے ہو کہ یہ فخرِ کائنات کی اُمت کے نو دمیدہ غنچے ہیں۔ جن پر بُری طرح صحبت کا اثر نمایاں ہو رہا ہے۔ اور یہی کل بد نصیب مسلمانوں کی قوم کے ایک فرد ہوں گے۔ اور انہی افراد کے مجموعہ کا نام قوم ہوگا۔ اور اس قوم کی تباہی کا کیا ٹھکانا ہے جو ایسے گہوارہ میں پرورش پائے۔ یہ سب باتیں جاننے کے باوجود کیا تمہارا یہ فرض نہیں ہے کہ تم ان باغِ محمدیؐ کی نوشگفتہ کلیوں کو بُری صحبت کی بادِ صرصر سے بچاؤ؟ اگر تم سچے مسلمان ہو تو تم کو ان آوارہ، فحش گو، بدتمیز لڑکوں کو راہِ راست پر لانا پڑے گا

ایک مسلمان کے لئے وہ وقت بڑا نازک اور آزمائش کا ہوتا ہے۔ جب اس کے دو دوست اس کو اپنا جج تسلیم کر لیں۔ کمزور طبیعت کا مسلمان یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے سے اپنے دونوں دوستوں کو خوش کرے۔ حالانکہ انصاف یہ نہیں چاہتا۔ کہ جس سے زیادہ تعلق ہے۔ اس کو فائدہ پہنچائے۔ مگر یہ فیصلہ کرنے سے پہلے اس کو بھول جاتا ہے۔ کہ جس فخرِ کائنات کا وہ غلام ہے۔ اس نے فرمایا ہے کہ "اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرے گی تو اُس کا بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔"

پس اے وہ لوگو! کہ شخصیت سے مرعوب ہوتے ہو۔ تعلقات کی زنجیروں میں اُلجھتے ہو اور حق کشی کے لیے تیار ہو جاتے ہو۔ خدارا مجھے بتاؤ، کیا تم حقیقتاً مسلمان ہو؟ اور کیا تم نے آقائے دو عالم کی تعلیم کو سمجھ لیا ہے؟ اور کیا تم کو خیر الامت کہا جا سکتا ہے؟

حریت ۳۰- اپریل ۱۹۱۴ء

تو ہی بتا اے غدار و بیکس انسان

(۲۹)

تم روزانہ دیکھتے ہو کہ جس وقت کوئی انسان کسی جانور کو دانہ پانی دیتا ہے تو وحشی سے وحشی جانور اس کے حکم کو نہیں ٹالتا۔ درندے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پرندے اس کے اشاروں پر چلتے ہیں۔

مگر کیا تم نے ایک لمحہ کے لئے بھی غور کیا ہے کہ کیا تم اپنے رزاقِ مطلق کو اسی طرح پہچانتے ہو جس طرح اُڑنے والی چڑیاں اپنے دانہ ڈالنے والے کو۔ اور کیا تم اپنے مشکل کشا کی آواز پر اسی طرح دوڑتے ہو جس طرح آہوئے وحشی چارہ کی خبر گیری کرنے والے کی آواز پر دوڑتا ہے۔ اور کیا تم اسی طرح اپنے آقا اور مولے کے وفادار ہو جس طرح ایک کتا سوکھی روٹی کا ٹکڑا کھا کر ہمیشہ کے لئے طوقِ غلامی اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے۔ اور جب اپنے آقا کو دیکھتا ہے دُم ہلا کر اُس کے قدموں میں لوٹنے لگتا ہے۔

پھر حیف ہے تم پر کہ تم انسان ہو کر، اشرف المخلوقات ہو کر، خیر الامم ہو کر داعی امر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہو کر اپنے پیدا کرنیوالے اپنے پالن ہار، اپنے رزاقِ مطلق کو نہ پہچانو۔ اس کی آواز نہ سنو۔ اس کے

عطا کردہ نعائم و لذائذ کا شکریہ ادا نہ کرو۔ اور اس کے باغیوں اور سرکشوں میں شامل ہو کر اپنی ہستی کو فراموش کر جاؤ۔ اور اس کے ساتھ ہی لعنت ہے تم پر کہ تم جس کی ملازمت کرو۔ اس سے غداری کرو۔ جس کا نمک کھاؤ نمک حرامی کرو۔ جس کے دوست بنو۔ اس کو دھوکہ دو۔ اسکی دل آزاری کے درپے ہو کر بھی اپنے تئیں انسان سمجھو۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ جس نے انسان کا شکر ادا نہ کیا اُس نے خدا کا شکر بھی ادا نہ کیا۔

میں اپنے باغ میں صبح کے وقت چہل قدمی کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ قدرت کے دسترخوان سے اس کی مخلوق شکم پُری کر رہی ہے۔ بہتر سے بہتر پھل طوطے اور دوسرے جانور کتر کتر کر نیچے پھینک رہے ہیں۔

مجھے آزاد طیور کی اس بے رُخی پر بہت غصہ آیا۔ فوراً بارہ دری میں گیا۔ اور جوش میں اندھا ہو کر بندوق لے آیا۔ کارتوس ڈالا۔ اور گھوڑے کو حرکت دینے کے لئے اس واسطے آمادہ ہو گیا کہ چند پھلوں کی خرابی کے انتقام میں ایک منٹ میں سب پرندوں کو زمین پر خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھوں۔

ہائیں! یہ کیا ہوا؟ میرا وہ ہاتھ جس میں بندوق اور بندوق کا گھوڑا تھا، کانپنے لگا۔ اور انتقام پسند نگر بنجر سے بھی زیادہ سخت دل موم کی طرح پگھلنے لگا۔ اور بندوق ہاتھ سے گر گئی۔ کیوں؟ اس لئے کہ مجھے یہ خیال آگیا کہ تو ایک ذرۂ بے مقدار اپنے چند بے حقیقت

پھلوں کی خرابی پر اس قدر خفا ہو کر ایسا سفاکانہ فعل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن وہ بے نیاز اور قہار و جبّار ذات اگر تیری نافرمانیوں کا انتقام لینے پر کبھی آمادہ ہو گئی تو، تو ہی بتا، اسے اپنے آقا کے در سے بھاگے ہوئے غلام کے اپنے لئے تو کیا سزا تجویز کرتا ہے؟

(حریت ۷۔ مئی ۱۹۲۲ء)

دل کے آئینہ میں

(۳۰)

کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اگر تمہاری زبان نے تمہارے دل اور دماغ کی غمازی کر دی، اور تمہارے ان بُرے خیالات نے اگر عملی صورت اختیار بھی کر لی جن کے اظہار کی تمہاری زبان کو جرأت نہیں ہوتی تو تم کو اس وقت کیسی ذلت اور ندامت ہو۔

مگر کیا تم ان بُرے خیالات کو اپنے دل میں چھپا کر مطمئن ہو اور تم کو یہ یقین ہے کہ وہ علام الغیوب بھی تمہارے خیالات سے بے خبر ہے جس کے پاس تمہاری پیدائش سے پہلے تمہارے خیالات کا ریکارڈ موجود ہے

(۳۱)

تم نے بازار میں ایک حسین ترین صورت دیکھی، تمہارا حسن پرست دل مچل گیا اور تم اس حُسن کی دلبری کی رعنائی و دل ربائی پر اپنا نقد دل نثار کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ حسن پرست دنیا کس چیز پر فدا ہوتی ہے؟

جس انسانی صورت پر چار چلو تر و تازہ خون ہو گا۔ اس کی دلربائی اور خوش نمائی خالق جذبات ہو گئی۔ اور خون کی صفائی سے حُسن کی تمام

دل فریبیاں وابستہ ہیں۔ یہ صرف جسم میں خون ہی ہے کہیں سے گلاب کی مانند شاداب رخسارے نظر آتے ہیں۔ اور سڈول جسم سنگ تراش کی صناعی کا مظہر ہوتا ہے اور چہرہ اور جسم کی رعنائیاں سب جگر کی گلگوں فشانی کی رہینِ منت ہیں جس وقت عصبی نظام میں خرابی پیدا ہوئی۔ آہ وہ حسین ترین چہرہ جس پر تم ہزار جان سے فدا تھے ڈراؤنی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور حُسن کی دیوی جس پر تمہاری نظریں پھسل جاتی تھیں اب نہایت بھیانک صرف اس لئے نظر آتا ہے کہ رگوں میں دوڑنے والا خون، اب چہرہ میں نہ تھا۔ اور رخسارے گلاب کے پھول کی مانند تازہ ہونے کی بجائے کیکر کے پُھول کی طرح زرد تھے۔ اگر تم اس صناع مطلق کو ایک دفعہ دیکھ لو تو بتاؤ اس کی نذر کے واسطے تمہارے پاس کیا تحفہ ہوگا؟ جبکہ تم اپنا دل اس حسینہ کو نذر کر چکے ہو۔

(۱۳)

تم کہتے ہو کہ تم کو اپنے زوال کا فکر ہے۔ کیونکہ تم روزانہ مشاہدہ کرتے ہو کہ بچوں کو دیکھنے کے بعد تم کو تمہارے زوال پذیر اعضاء بڑھاپے کی خبر دیتے ہیں۔ سورج چاند کے زوال کا اعلان کرتا ہے۔ اور شام کی سیاہی سورج کے زوال کا مرثیہ پڑھتی ہے۔ غرضکہ جس طرف نظر اُٹھا کر دیکھتے ہو فنا ہی فنا کا منظر آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ مگر کیا واقعی تم کو اس کارزارِ عالم کے فنا ہونے کا یقین ہے؟

اگر یہ سچ ہے کہ یہ عالم ایک روز فنا ہوگا، تو خدا کے لئے مجھے بتاؤ

کہ کیا تم اپنے محبوب کو فانی سمجھتے ہو جس کو لازوال سمجھ کر محبت کی پینگیں بڑھائے چلے جا رہے ہو۔ تم اگر آبگینۂ محبت کو فانی سمجھتے تو اس پر اپنا دل صدقے نہ کرتے۔

(۴)

تم روزانہ دیکھتے ہو کہ اگر کسی کریہہ المنظر چہرہ پر بھی کوئی داغ دھبہ ہوتا ہے تو پیرسوپ اور اوٹین کریم کے ذریعے اس کو صاف کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر کیا ساری عمر میں ایک دفعہ بھی یہ گمراہ انسان اپنے دل کی سیاہی دور کرنے کی کوشش کرتا ہے؟ حالانکہ اس کو یقین ہے کہ یہاں کی روسیاہی سے وہاں کی ناکامی کا تخیل بہت روح فرسا ہے۔ مگر غافل انسان عیشِ چند روزہ میں اپنے اصلی مقام کو فراموش کر دیتا ہے اور اس کو بھول جاتا ہے کہ ایک روز کسی زبردست ہستی کے سامنے جواب دہی کرنی ہے۔ اور آہ کہ وہ دن دُور نہیں۔ کاش اس بھاگے ہوئے غلام کو معلوم ہوتا کہ مولائے بے نیاز کی بارگاہ میں سفیدی بغاوت کی سیاہی پر غالب آ جاتی ہے۔ لیکن اُس وقت جبکہ چشمِ تر جبیں سجدہ ریز ہو۔

(حریت ۲۱ مئی سنہ ۲۲ء)

دوست دشمن کیونکر بنتے ہیں؟

(۳۱)

تم نے کبھی روزمرہ کے اس تجربہ پر بھی غور کیا ہے کہ ایک عرصہ کی محنت اور کوشش کے بعد غیر دوست ہوتے ہیں۔ لیکن دشمن ہمیشہ دوستوں میں سے لمحوں اور منٹوں میں پیدا ہو جاتے ہیں؟ کیا تم اب غور کرو گے کہ تمہارے دشمن آسانی کے ساتھ دوست نہیں بن سکتے۔ لیکن تم نے اپنے دوستوں کو دشمن بنانے میں کبھی دقت نہیں اٹھائی۔

سنو! سنو! تمہارا ایک سکنڈ کا غیر مدبرانہ طرز عمل تمہارے بہترین دوست کو دشمن بنانے کے لئے کافی ہے۔ تمہاری زبان سے نکلا ہوا ایک بے پناہ تیر تمہارے بہترین رفیق کا کلیجہ چھلنی کر کے تمہاری رفاقت کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ تمہاری ایک لمحہ کی خود غرضی تمہارے مخلص ترین دوست کو کھو دیتی ہے۔ اور کیا یہی وہ دوست ہیں جن پر اعتماد کر کے تم نے اپنی زندگی کے اہم ترین راز پوشیدہ نہیں رکھے۔ اور اپنے تجارتی وسائل کو نہ چھپایا اور ہر طرح ان کی اعانت کر کے ان کو ترقی کے وسائل میں امداد دی؟

پھر جب حقیقت یہ ہو کہ سالہا سال کے دوست ذرا سے مالی فائدے کے لئے طوطے کی طرح آنکھیں بدل لیں۔ برسوں کی تمہاری خدمات کو فراموش کر دیں تو کیا ان تجارب کے بعد بھی تم اپنے دوستوں کو ان آلات

حرب سے مسلح کرو گے جو تمہارے بنائے ہوئے ہوں، اور مارِ آستین بنکر تمہارے دشمن بن جائیں؟

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم کسی انسان پر اعتماد نہ کرو۔ بلکہ میری خواہش تو یہ ہے کہ دوسروں کی حماقتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ اور ہر شخص کو دوست بنانے وقت یہ فراموش نہ کرو کہ یہ دشمن بھی بن سکتا ہے۔

تم نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کے طرزِ عمل سے پریشان ہوکر ترکِ وطن پر کمر باندھی۔ گھر سے بے گھر ہوئے جنگل میں ڈیرا ڈالا۔ مگر یہ بھی غور کیا کہ کہیں وہ بُری عادتیں بھی چھوٹیں، جنھوں نے اپنوں کو بیگانہ، عزیزوں کو مخالف، دوستوں کو دشمن بنا لیا۔ جب وہی عادتیں اور خصلتیں ہجرت کے بعد بھی قائم رہیں تو اس جلا وطنی سے فائدہ ہم جہاں جاؤگے اپنی عادات وخصائل کی وجہ سے اپنوں کو بیگانہ بناؤگے بہتر ہے کہ اپنی بُری عادتوں میں تبدیلی پیدا کرو۔ تاکہ نہ تمہارے رفیق تم سے بھاگیں اور نہ تم ترکِ وطن کے لئے مجبور رہو۔

تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ جب تم پیدا ہوئے ہو تو اس دنیا میں تمہارا کوئی دشمن نہ تھا۔ بلکہ تمہارے پیدا ہوتے ہی ماں باپ عزیز و اقارب نے خوشیاں منائی تھیں۔ لیکن جب تم سن شعور کو پہونچے تو کچھ لوگ تمہارے دشمن ہو گئے۔ یہ کیوں؟

اگر حقیقتاً تمہاری ذات سے کسی کو کوئی عداوت ہوتی تو وہ پہلے دن ظاہر ہوتی۔ کیا واقعہ نہیں ہے کہ دوسروں کو دوست یا دشمن بنانا خود تمہارے اپنے طرزِ عمل پر منحصر ہے؟

مسرت و الم اور حظ و کرب یہ ایسے الفاظ ہیں کہ جس وقت انسان پر ان کی حالت طاری ہو جاتی ہے تو وہ بالکل عریاں ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

اگر تم کو کسی بڑے سے بڑے مدبر اور صائب الرائے کی اصلیت کا پتہ چلانا ہو یا اس کی صحیح فطرت کا مطالعہ کرنا ہو تو کوئی جملہ ایسا کہو کہ اس پر ان دونوں میں سے ایک حالت طاری ہو جائے اور پھر دیکھو کہ وہ مستقبل سے بے پرواہ ہو کر تکلف اور تصنع۔ تدبر اور اصابتِ رائے کی نقاب اُتار کر سامنے آجاتا ہے۔ اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی روشنی کتنے ڈگری کی ہے۔

تم سے اگر کوئی تمہارا مخلص ترین دوست یہ کہے کہ تم اپنے بھرے پُرے گھر کو پٹرول ڈال کر آگ لگا دو تو تم فوراً یا تو اس سے ناراض ہو جاؤ گے یا اس کی دماغی خرابی پر غور کر کے صبر کر دو گے۔

لیکن کیا تم نے اپنی گذشتہ زندگی کی ان فضول خرچیوں اور رسم پرستیوں پر کبھی غور کیا ہے۔ جن کی بدولت آج تمہاری مالی حالت خراب

ہو گئی ہے ؟ اور تمہاری اولاد کا مستقبل تاریک ہو گیا ہے۔ اگر غور نہیں کیا تو کیوں ؟

• کیا تم اپنے اس نوکر سے خوش ہو گے جس کو تم بازار صرف سودا خریدنے کے لئے بھیجو اور وہ بازار میں بازی گر کا تماشہ دیکھنے میں مصروف ہو جائے۔ اس سوال کا جواب ایک ہی ہو سکتا ہے کہ نہیں۔ تو پھر کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ تمہاری زندگی اور تمہاری بعثت کا راز کس کارزار عالم میں اس سے زیادہ نہیں ہے کہ تم اس عالم میں نیکیاں خریدنے کے لئے اپنے آقا اور اپنے مولیٰ کی طرف سے بھیجے گئے ہو۔ نہ کہ مردم آزاری نخوت پسندی۔ انسانیت سوزی اور شخصیت پرستی کے لئے۔ اور کیا تم نے مکروہات دنیا میں مصروف ہوتے ہوئے یہ بھی غور کیا ہے کہ تمہاری اس شیطانی مصروفیت سے ناراض ہو کر اس عظمت و جبروت والی بارگاہ نے تمہارے لئے کیا سزا تجویز کی ہے۔ آہ! اگر تم اس عذاب الیم کی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ تو ایک لمحہ زندہ نہ رہو ؟

(حریت ۱۸ مئی ۱۹۶۲ء)

قول اور عمل

(۳۲)

یاد ش بخیر! ہمارے ایک مولوی دوست بات بات پر ان اللہ مع الصابرین کا ورد کرتے تھے۔ ان کی عجیب الخلقت لمبی چوڑی انگوٹھی پر یہی نقش تھا۔ اپنے حجرہ میں مصلّے کے سامنے انھوں نے یہی جملہ جلی حروف میں لکھ کر لگا رکھا تھا۔ پند و نصیحت کے وقت سارا زور بیان اسی کلمہ پر صرف اسی کلمہ پر صرف کرتے تھے۔ اور جب کبھی کوئی بندۂ عقیدت اپنی پریشانی کی داستان سُنا کر اُن سے امداد طلب کرتا تو وہ اپنی لمبی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر نہایت متانت کے ساتھ فرما دیتے تھے۔

ان اللہ مع الصابرین

ایک دن ہمارے مولانا دوست ہمارے ساتھ شکار کھیلنے گئے گرمی کا موسم تھا۔ دوپہر کا وقت ہو گیا تشنگی نے غلبہ کیا۔ ایسے دُبلے پتلے آدمیوں کے لئے پانی کا فقدان کچھ زیادہ تکلیف دہ نہ تھا۔ لیکن مولوی صاحب ٹھہرے فربہ اندام۔ پیاس کی شدت برداشت کرنا اُن کے دائرۂ امکان سے باہر تھا۔ لگے پانی کی تلاش میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے۔

ہم نہایت خاموشی کے ساتھ مولوی صاحب کی بنیا بیوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے اور مولوی صاحب بار بار جھلا کر ہمیں پانی کی جستجو کا حکم دیتے اور اپنی خشک زبان ہونٹوں پر پھیرتے۔ جب مولوی صاحب کی اُلجھن بہت بڑھ گئی تو ہم نے نہایت متانت کے ساتھ عرض کیا۔ مولانا

ان اللہ مع الصابرین

بس پھر کیا تھا ان اللہ مع الصابرین کا ہر دم ورد رکھنے والے تشنۂ لب مولوی صاحب کی آتشِ غضب بھڑک اُٹھی اور ہم سے ایسے ناراض ہوئے کہ سلام مسنون کا سلسلہ بند کر دیا۔

زبان سے کہنا دوسری چیز ہے اور عمل کرنا دوسری شے۔ جبتک اس کی تصدیق نہ ہو زبانی جمع خرچ سے کچھ نہیں ہوتا۔ دل نے تو ان اللہ مع الصابرین کی تصدیق نہ کی۔ اگر محض زبان سے اس کی رٹ لگائی تو کیا ہوا؟

تصدیق وہ علم نہیں ہے جو کتابوں میں ہو۔ یا درس و تدریس سے حاصل ہو سکے۔ ایک صاحبِ دل بزرگ کا یہ قول عین حقیقت پر مبنی ہے کہ

"صاحبِ توحید ہونا آسان ہے مگر صاحبِ تصدیق ہونا مشکل"

درگنز و ہدایا نتوان یافت خدا را!

در نسخۂ دل بیں کہ بیا غیے بہ ازیں نیست

(حریت ۱۴ جون ۱۹۲۸ء)

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن!
ہم تم دونوں ایک

(۳۳)

ہم تم کون ہیں؟ ظاہر میں دو! باطن میں ایک جس طرح گلاب کے پھول پر شبنم کا قطرہ ظاہر میں دو باطن میں ایک ہو کر کہتا ہے۔

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن!
ہم تم دونوں ایک!

قطرہ آسمان سے گر کر سمندر میں حباب بنا۔ حباب نے سمندر میں اپنی ہستی کو فنا کر کے کہا۔

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن!
ہم تم دونوں ایک

شمع کے گرد پروانوں کا ہجوم ہوا۔ کچھ ڈرپوک ڈرڈل نے بھی شمع پر چکر لگائے لیکن ایک غیور و جانباز پروانے نے شمع کی لَو پر سر رکھ کر کہا۔

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن!
ہم تم دونوں ایک

ساقی گلفام و گل اندام سے چھلکتے ہوئے پیمانہ نے مستانہ انداز

سے نشیلی انکھڑیوں کو نیم وا کرکے بادۂ خوار الست سے جھک کر کہا۔

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن!
ہم تم دونوں ایک

سنسار میں سب ہی دکھی ہیں ساجن، دکھی سے دکھی ملے تو دکھ سکھ ہوکر کہے۔

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن!
ہم تم دونوں ایک

کوئل آم کے مور سے، چاند چکور سے، پپیہے کی جگر دوز آواز سے یہی صدا آتی ہے۔

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن!
ہم تم دونوں ایک

تن ساجن کا۔ من ساجن کا، دھن ساجن کا۔ ہل ساجن کا سب گھل مل کر ایک ہوئے سکھی ری۔

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن!
ہم تم دونوں ایک

ساجن بن نیند نہ یا تا ہیں آئے۔ ساجن بن جیا تڑپے۔ ساجن کے درشن بن چین نہ آئے سکھی ری ساجن نہیں آئے۔

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن!
ہم تم دونوں ایک

ساجن بسے نینن میں، ساجن بسے من مندر میں۔ ساجن براجے ہردے میں، ساجن کے روم روم سے یہی آواز آئے۔

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن!

ہم تم دونوں ایک!

نگر نگر ڈونڈی پیٹ سکھی۔ ساجن سے ناکرے کوئی پیت سکھی۔ ساجن بڑے نروئی۔ ساجن بڑے کٹھور۔ ساجن کو مجھ پاپن پر دیا نہ آئے سکھی پھر بھی جیا یہی رٹ لگائے۔

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن!

ہم تم دونوں ایک

سمندر کا پانی بھاپ بن کر بادل بنا، بادل گرجا۔ گرج کر برسا، اور پھر قطرہ کی صورت میں سمندر کے پانی میں گر کر سمایا سمندر نے کہا۔

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن!

ہم تم دونوں ایک

گُل میں ساجن، بُل میں ساجن، تم میں ساجن، مجھ میں ساجن، مندر بھی ساجن، مسجد بھی ساجن، محرابِ عبادت نے کہا

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن!

ہم تم دونوں ایک

گوکل والے کی بنسری میں ساجن۔ کنس کے تختِ حکمرانی میں ساجن گوتم کے منتیا میں ساجن۔ یتیم کے نالۂ جگر دوز میں۔ محکوم کی آہِ نارسا

میں ساجن ، ابراہیمؑ کی چھری ، اسمٰعیل کی گردن ۔ رام کے بن باس میں ساجن ، جگدیش کے دربار میں ساجن ۔ حرا کے غار میں ، بدر کے میدان میں ساجن ۔ کربلا کے ریگ زار میں ، حسینؑ کے خشک گلے سے ٹپکنے والے لہو میں ساجن ، منصورؒ کی سولی ، سرمدؒ کے خنجر نے

ہنس کر کہا

ہم تم دونوں ایک ہیں ساجن !
ہم تم دونوں ایک

حریت ۱۱ - جون ۱۹۴۶ء

نین نیند نہیں آئے

(۴۴)

بہار کی نوشگفتہ کلی کھلنے سے پہلے گئی۔ ہنستا مکھڑا، مرجھائے سجنی۔ بالم نہیں آئے۔

نین نیند نہیں آئے

کومل من کی آشائیں۔ دل کو برمائیں، ہردے میں برہ کی ہوک اُٹھی۔ سیج ہے سونی سجنی۔ بالم نہیں آئے۔

نین نیند نہیں آئے

پریت کا دُکھڑا کس کو سناؤں۔ پریت کا غم کس کو بتاؤں۔ پریت کرکے پچھتائے سجنی، بالم نہیں آئے۔

نین نیند نہیں آئے

پریت ہے من کا سنجوگ۔ پریت ہے دُکھ کا روگ۔ پریت کیے بن چین نہ آئے سجنی۔

نینن نیند نہیں
آئے

کیوں رُوٹھ گئے پیتم۔ من کا بھید چھپائے پیتم۔ نینن ورشا برسائے
سجنی بالم نہیں آئے۔

نینن نیند نہیں
آئے

نگاہِ باز دید میں۔ آہ فلک رسا میں، آنکھوں سے گرنے والے
آنسو میں۔ سیج کے بچھے ہوئے پھولوں میں۔ من مندر میں۔ شریر کے
روم روم میں۔ پیتم سمائے پیتم بن

نینن نیند نہیں
آئے

سیج ہے سُونی۔ بادل گرجے۔ بجلی کڑکے۔ جیا دھڑکے۔ راتیں ہیں
ساون کی کاری۔ چھائی بدریا کاری، جیا لہرائے سجنی، بالم نہیں آئے۔

نینن نیند نہیں
آئے

پیتم گئے پردیس۔ مجھ ابھاگن کو۔ برہن کو گئے بھُول، سجنی پیتم بن

نینن نیند نہیں آئے!

سجنی گھائل بالم ہیں اُن بھول، سندر مکٹ کی چھب دکھا کر، مُسکا کر کر گئے نینن کے تیر سے گھائل

نینن نیند نہیں آئے!

کب آؤ گے پیتم، پیارے ؟

(۵۰)

نگر، نگر ڈھونڈت ہوں سوامی کو، پیتم کو۔ من مندر میں ستھاپت ہونے والے دیوتا کو، ہردے میں سما جانے والی مورتی کو۔

کب آؤ گے پیتم، پیارے ؟

پیتم کی تلاش میں، پنڈلیاں ہوگئیں چکنا چور۔ تلوؤں میں پڑ گئے چھالے۔ رہ گئے پاؤں چلتے چلتے۔ تھک گئیں آنکھیں راہ تکتے۔

کب آؤ گے پیتم، پیارے ؟

ایک طرف پریت کی ماری بیٹھی تکتی ہوں راہ تمہاری۔ ایک طرف پریم مندر میں کٹیا تمہاری۔ بیچ نینن کی ندیا جاری۔

کب آؤ گے پیتم، پیارے ؟

کیسے آؤں، کیسے جاؤں، پی بن چین نہ آئے۔ ندی کنارے کشتی کھڑی بے سہارے۔ ملاح گیا دور۔ پتوار گئے ٹوٹ۔ ہوں میں مجبور۔

کب آؤ گے پیتم، پیارے ؟

جنگل ہے سنسان، کچھار سے شیر گرجے۔ پپیہا پی کہاں کی رٹ لگائے۔ کوئل رہی کوک۔ امواپر گئے مور۔ جیا گھبرائے

کب آؤ گے پیتم پیارے ؟

من میں ہوک اٹھتی ہے ، چاندنی چٹک رہی ہے ۔ چندرما ندّیا میں عکس ڈالے مُسکائے ۔ چندرمان سے مجھے لجّا آئے ۔

کب آؤ گے پیتم پیارے ؟

ترے نام کی سُمرن جپوں ۔ تمہارے سندر مکھ کے درشن کی آشا لگی بھگوان ۔ پریم کی مدھورا کو ترست ہوں ۔

کب آؤ گے پیتم پیارے ؟

ساتھی ہیں ہم تم جنم جنم کے ۔ آئی ہوں ترے دوارے بشمہ کرد پیتم ۔ رکھو بانہہ پکڑے کی لاج ۔

کب آؤ گے پیتم ، پیارے ؟

دیکھو ت مکھ سُندر ، پل میں کٹ جائیں سنکٹ سارے ۔ چنون رس ڈالے ۔ ڈارے گلے بہیّاں ۔

کب آؤ گے پیتم ، پیارے ؟

پیتم پیارے

حسرت ۲۵ جون ۱۹۴۴ء

پیا نہیں آئے!

(۳۶)

پیا نہیں آئے سجنی۔ سونی پڑی ہے سیج۔ پیا بن موہے چین نہ آئے۔ پیا گئے کتھ دیس سجنی!

پیا نہیں آئے!

پریت کی ریت ہے نیاری، پریت کئے دکھ ہوئے۔ پریت کئے بن رہے نہ کوئے سجنی۔

پیا نہیں آئے!

امواکی ڈالی پہ کوئل رہی کوک، موہے من میں ہے کلیش سجنی، پیا ہیں بڑے کٹھور۔

پیا نہیں آئے!

پریت دیکھے نہ دیسی بدیسی۔ پریت دیکھے سنگ نہ ساتھی۔ پریت ہے من کا روگ سجنی۔

پیا نہیں آئے!

پریت دیکھے نہ جات پات، پریت کئے کیوں پچھتائے۔ بالم ہیں اَن بھول۔

پیا نہیں آئے!

پھولوں کی سیج پیا بن، کانٹوں کی سیج کہلائے سجنی۔ پیا بن
گدگدی نہ آئے

پیا نہیں آئے!

گھٹا چھائی گھنگھور۔ بدروا مچائے شور۔ دو یا دل بیچ بجلی تڑپ
کر نکل جائے سجنی۔ موہے یاد کسی کی ستائے۔

پیا نہیں آئے!

حریت ۱۳ دسمبر ۲۲ء

عید کے دن مسلمان

(۳۷)

اللہ اللہ! وضع لباس کی یہ گوناگونی اور پوشش و رنگ کی یہ بوقلمونی۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ حُسن اور رنگینی کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ یا قوس وقزح کسی اتفاقی حادثہ کی بجائے سطح زمین پر پھیل گئی ہے کہیں پگڑی ہے کہیں ترکی ٹوپی۔ کہیں گول ٹوپیاں نظر آ رہی ہیں کہیں کشتی نما۔ کسی طرف دوپلی ٹوپیوں کی افراط ہے۔ اور کسی طرف گاندھی کیپوں کی۔ کہیں کوٹ پتلون۔ کالر اور نکٹائی کا جلوہ نظر آ رہا ہے تو کہیں انگرکھے اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ کسی جگہ لمبے کوٹ اور شیروانیاں ہیں۔ اور کہیں چوغے اور عبائیں۔ پاجامے چوڑی دار اور چُست بھی نظر آ رہے ہیں۔ اور ڈھیلے ڈھالے پتلون بھی۔ اور بیچ بیچ میں کہیں کہیں دو چار پنجابی تہمد بھی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

کپڑے کی قسموں کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بڑھیا سے بڑھیا ریشم نفیس سے نفیس سُوتی چکنیں۔ ڈوریے اور تن زیبیں۔ عمدہ سے عمدہ لٹھے۔ جامدانیاں۔ بہتر سے بہتر زربفت اور کمخواب۔ ہر سڑک اور گلی بالکل کسی بزاز کی دوکان معلوم ہو رہی ہے۔ جس پر نمائش کی غرض سے طرح طرح کے رنگین اور نفیس کپڑے پھیلے پڑے ہوں۔ جدھر نگاہ اُٹھتی ہے

یہی نظر آتا ہے کہ لنکا شائر اور مانچسٹر کے کارخانے والوں نے ہزارہا کی تعداد میں اپنے ایجنٹ بھیج دیے ہیں جو مختلف قسم کے کپڑوں کے نمونے لیے چل پھر کر دکھاتے پھر رہے ہیں۔

بازاروں میں اچھا خاصا میلہ لگا ہوا ہے۔ حلوائیوں کی دوکانوں پر مٹھائیوں کے انبار دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح کوئی بڑی سے بڑی انسانی جماعت بھی اتنی بہت سی مٹھائی کھا سکتی ہے۔ لیکن جب منٹوں کے اندر تھال کے تھال خالی ہوتے نظر پڑتے ہیں۔ تو مجبور ہو کر یقین کر لینا پڑتا ہے کہ وہ سب کام میں آ ہی جائے گی۔

تنبولیوں کی مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ ایک آدمی کی بجائے دوکان پر تین تین آدمی کام کر رہے ہیں۔ پھر بھی کسی طرح گاہکوں کی بھیڑ کم نہیں ہونے پاتی۔ سگرٹوں کا دھواں سروں پر اس قدر چھا گیا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی باریک کپڑے کی چھتریاں لوگ لگائے ہوئے ہیں۔ یا یہ کہ اس انسانی سمندر سے بادل اُٹھ اُٹھ کر آسمان کی طرف جا رہے ہیں۔

کھلونے مٹّی کے۔ ٹین کے۔ ربڑ کے۔ سیلولائڈ کے۔ لکڑی کے۔ کاغذ کے۔ کپڑے کے۔ غرضکہ ہر اُس چیز کے کہ جسے توڑ مروڑ کر کوئی شکل دی جا سکے۔ لاکھوں کی تعداد میں جا بجا دوکانیں موجود ہیں۔ اور انسانی بچّے جو زیور اور عجیب الوضع لباس کی وجہ سے خود ہی ایک مضحکہ انگیز کھلونا بنے ہوئے ہیں ان دوکانوں پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔

پانوں کی پیکوں سے سڑک پر عجیب و غریب نقش و نگار بن گئے ہیں۔ اور ہر دو جانب کی نالیوں میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا خون بہہ رہا ہے۔

عید! او ہو آج عید ہے۔ مگر عید کے معنی تو خوشی اور خرمی کے ہیں؟ کیا ان میں سے کسی ایک مسلمان کے چہرے سے بھی خوشی کے آثار ہویدا ہیں؟ کیا ان میں کوئی ایک بھی تندرست اور توانا نوجوان نظر آرہا ہے؟ کیا ان کے یہ زبردستی کے قہقہے بالکل بیماروں کی مسکراہٹ کی طرح بدنما نہیں معلوم ہوتے؟ کیا یہ اسی قوم کے افراد نہیں ہیں کہ جس کی آدھی سے زیادہ آبادی کو دونوں وقت سوکھی روٹی بھی میسّر نہیں آتی؟

کیا تقریباً ہر خوش پوش مسلمان کے پیچھے ایک میلا کچیلا خستہ حال فقیر بھیک مانگتا نہیں چلا آرہا ہے؟ جس قوم کی آدھی آبادی ننگی بھوکی ہو، جس قوم کے لاکھوں افراد کو عید کے دن بھی روٹی میسّر نہ آتی ہو۔ اور جس قوم کی کروڑوں بیوائیں اور یتیم آج کے دن بھی میلے اور پھٹے پرانے کپڑے پہننے پر مجبور ہوں، کیا اُسے بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ خوشیاں کرے اور عید منائے۔ اور نئے کپڑے پہنے۔ اور مٹھائیاں کھائے؟ مگر یہ تو مسلمانوں کا ذکر ہے۔ چودھویں صدی کے مسلمانوں کا؟ آج تو مسلمان کے لئے یہ بھی جائز ہو گیا ہے کہ وہ دوسروں کی غلامی کرے۔ جاہل اور بے علم رہے۔ جھوٹ بولے۔ سود کھائے۔ رشوتیں لے

اور دے۔ شرابیں پیئے، فحش اور بدکاری میں مبتلا رہے۔ اور چند پیسوں کے بدلے میں دین اور ایمان سب کچھ بیچ کھائے۔

ہاں تو آج عید ہے؟ اللہ مبارک کرے۔ غنیمت ہے کہ دس کروڑ میں سے پانچ لاکھ تو خوش ہیں۔

آج اُن کی بھی عید ہے، جنھوں نے پورے رمضان میں ایک روزہ بھی نہیں رکھا۔ آج اُن کی بھی عید ہے جنھوں نے پورے سال میں ایک وقت کی بھی فرض نماز ادا نہیں کی۔ جنھوں نے صیام رمضان میں۔ بازاروں میں نہایت بے حیائی سے کھایا پیا۔ قرآن شریف سننے کی بجائے شرابیں پی کر فحش گالیاں بکیں۔ اور خداوند قدوس سے بغاوت کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔

لیکن اگر یہ سچ ہے کہ جو رویا نہیں اُسے ہنسنے کا کیا حق ہے؟ تو یہ بھی سچ ہے کہ جس نے روزے نہیں رکھے، جس نے نماز نہیں پڑھی اُسے عید کی مسرّتوں میں حصّہ لینے کا کیا حق ہے؟ اور عید سے اُسے کیا واسطہ؟

حریت، ۷ ستمبر ۱۹۴۵ء

چاند کی آنکھ مچولی

(۳۸)

تیرھویں کا چاند نکلا ہوا ہے۔ تاروں کی کھُرچن نے چاند کی روشنی کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ مغرب سے گھٹا اُٹھی۔ کاری بدریا چھائی۔ بجلی کی کڑک بادل کی گرج میں ابر کا ایک ٹکڑا آیا۔ اور چاند نے بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلنی شروع کر دی۔

رات کے سنّاٹے میں، نُور کی فضا میں، تاروں بھری رات میں، مسکرا کر چاند سے پوچھا یہ آنکھ مچولی کیوں ہے؟

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

چاند نے زہر خندہ سے کہا۔

"ایک وقت تھا میری ٹھنڈی روشنی آزاد اور متحدہ ہندوستان پر پڑتی تھی، اور میں سمجھتا تھا کہ ہندوستان ایسا ہی خوش حال رہے گا لیکن آہ! آزادی کی مسلح جدوجہد ناکام ہوئی۔ بوڑھا مغل بادشاہ (ظفر) اسیر ہوا۔ بیٹوں۔ پوتوں کے کٹے ہوئے سر مغل عظمت کے مرثیہ خواں کے سامنے آئے۔ اور ہندوستان کی غلامی۔ نکبت، افلاس۔ نا اتفاقی پر آخری مُہر لگ گئی۔ بھائی کے خون کا بھائی پیاسا ہے۔ مُجھو کا اور بے ہنر ہندوستان اپنے لئے لعنت، دنیا کے لئے غلامی کا سبب بنا ہوا ہے۔

اُس وقت سے برسوں گزر گئے۔ میں اس لئے بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہوں کہ بادلوں میں چھپ کر ہندوستان کی محکومی اور غلامی پر دو آنسو بہا لیتا ہوں۔ آہ! یہ منھ اب اس قابل کہاں کہ آزادی کا سورج طلوع ہونے سے پہلے دکھا سکوں!"

چاند کا لیکچر جاری تھا۔ میں دودھ سے زیادہ سفید جامع شاہجہانی کے گنبد پر حسرت کی نظر ڈال رہا تھا۔ کہ امام جامع مسجد نے سینڈ ہے کی آواز میں کہا۔" اللہ اکبر"

میں نے چاند سے دریافت کیا، کیا حقیقت یہی ہے؟ چاند نے ہنس کر کہا۔

"زبان سے اللہ کی بڑائی کا اقرار ہے۔ لیکن دل انگریز کی بڑائی کے آگے جھکا ہوا ہے۔

فتنۂ ملّت بیضا ہے امامت اس کی — جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے"

میں نے شرمندگی کی نظریں جھکائیں۔ اور چاند قہقہہ لگاتا ہوا بادلوں میں چھپ گیا۔ اور میں حسرت سے چاند کی آنکھ مچولی دیکھتا رہ گیا۔

حریت ۱۱ ستمبر ۱۹۲۲ء

سکونِ دل کی تلاش

(۳۹)

میاں بیوی کی کِل کِل ۔ بال بچوں کی چیخ و پکار ۔ کنبہ ۔ رشتہ کے جھگڑوں ۔ دوستوں ، عزیزوں کے جھمیلوں ۔ حاسدوں ۔ تنگ ظرفوں کمین دشمنوں کے مقابلوں سے تھک گیا ہوں ۔

مجھے سکونِ دل کی تلاش ہے !

بچپن کے الہڑپن ، جوانی کے جوش ۔ بڑھاپے کی عاقبت اندیشی ، کاروبار کی مشغولیت ۔ احباب کی کثرت سے تنگ آکر دیوانہ وار دوڑ رہا ہوں کہ

مجھے سکونِ دل کی تلاش ہے !

گوشۂ عافیت کی تلاش میں ، مسجد میں گیا ، خدا کا گھر تھا ۔ محمود و ایاز کو ایک ہونا چاہیئے تھا جبینِ نیاز کو عاجز نواز قدوس کی بارگاہِ ناز میں سجدہ ریز ہونا چاہیئے تھا ۔ لیکن مذہب کے نام پر جمع ہو کر مذہب میں تفریق کرنے ۔ خود ساختہ اسلام کے نام پر حنفی ، وہابی ۔ مالکی شافعی لیگی ۔ کانگریسی کو آپس میں دست و گریباں دیکھا ۔ اس ہنگامہ آرائی میں سکونِ دل کہاں ، اللہ کا حقیر بندہ اللہ کے گھر سے بھاگا کہ

مجھے سکونِ دل کی تلاش ہے !

خانقاہ میں مکر و ریا کی حکومت دیکھی۔ فریب و دغا کے پھندے دیکھے معنوعی طالب مولیٰ کو حقیقی طالب دنیا دیکھا۔ تاجدارِ فقر کو حصولِ زر کے لئے دنیا داروں کے پیروں پر کتّوں کی طرح دُم ہلاتے دیکھا۔ خدا پرستوں کو اَمرد پرستی میں مبتلا پایا۔ دنیا والوں سے بے پروا کو حُبِّ جاہ میں منہمک پایا۔ لاہوت کو عالمِ ناسوت میں دیکھنے دکھانے والوں کو شرابِ ناب میں مدہوش دیکھا۔ اور وہ کچھ دیکھا جس کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آیا۔ دم گھٹنے لگا۔ مکر و فریب کی اس درگاہ سے بھاگنا چاہتا ہوں کہ

مجھے سکونِ دل کی تلاش ہے!

دل نے کہا پگلے! جس سکونِ دل کی تجھکو تلاش ہے، وہ فاتح عالم سکندرِ اعظم کو نہیں میسّر آیا۔ فلاسفرِ اعظم ابن رشد و بوعلی سینا کو نہ ملا۔ شاعرِ اعظم کالی داس کو اس کی تلاش تھی مغلِ اعظم (اکبر) اس کا متلاشی تھا۔ چالیس کرور انسانوں کے دلوں پر حکومت کرنے والے لنگوٹ بند باغی فقیر۔ رہبرِ اعظم (مہاتما گاندھی) کو اس کی تلاش ہے۔ جب یہ سب اس محبوب کو نہ پا سکے تو پھر

سکونِ دل کہاں؟

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کہاں جائیں؟
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

حریت ۱۱ ستمبر ۴۶ء

کوئل سے

(۴۰)

موسم برشگال کا پیام دینے والی کوئل۔ آموں کے درختوں پر ڈیرہ ڈالنے والی کوئل۔ جنگلوں میں بسیرا لینے والی کوئل، اپنے حسین جسم کو برہ کی آگ میں پھونکنے والے سرمگیں پیکر، بتا کہ تجھے کس کی تلاش ہے؟

کسی کی محبت میں دیس سے پردیس جانے والی کوئل کسی کی یاد میں نالۂ شیون سے جنگل کو ماتم کدہ بنانے والی حسین کوئل، بتا کہ تو کس کی تلاش میں سرگرداں ہے؟

رات کے سناٹے میں کوکو کا شور مچا کر دنیا کو سر پر اُٹھانے والی کوئل ننھے سے دل میں عشق کی آگ بھڑکانے والی بپتا کی ماری کوئل! تو ایک درسِ حقیقت ہے چشمِ بینا کے لئے، بتا کہ تجھکو کس کی تلاش ہے؟

میں اس نگار خانۂ فطرت کا عاشق، اور تو فطرت کی غماز برہوگن، بتا بتا کہ کیا تو مجھکو اپنی محبت کا راز دار بنائے گی؟

تو جو وقفِ حزن و ملال ہے، تو جو جنگل کے ہر بن میں اپنے ستانہ نغموں سے آگ برسا رہی ہے، بتا کہ کیا میں تیرا ہم جلیس ہونے کے قابل نہیں؟

نہ چھپا، نہ چھپا، اپنا رازِ ہستی مجھ سے اے کالی کوئل مجھ سے نہ چھپا عشق کی آگ میں زندہ جاوید ہونے والی، انسان سے زیادہ ذی حس ایک

مشت پر و استخواں، اے دکھیاری کوئل مجھ سے نہ چھپا۔ اپنا رازِ ہستی نہ چھپا۔
عشق کی زبان میری آنکھوں میں بول رہی ہے۔ میرا ستم زدہ دل گواہ ہے۔ اور وہ تیری طرح لرز رہا، کانپ رہا ہے۔ کہ اس کو بھی کسی کی یاد ہمیشہ کے لئے گھلائے دیتی ہے۔ اور زخمی دل سے خون کے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اے پیاری کوئل تیری ملاقات سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ عشق کیا چیز ہے؟ پھر کیا ان حالات کو سنا کر بھی تو مجھے اپنا شریکِ غم نہ بنالے گی؟ کہ تو میری ہستی کی شرح ہے۔ اور کیا اب بھی میں تیرا رفیق و ہمدم اور ہمراز بننے کا اہل نہیں؟ بتا خدا کے لئے جلدی بتا۔ اے عشق کا درس دینے والی بتیا کی ماری کوئل جلدی بتا!

آرٹ فروری ۱۹۲۲ء

عشق کیا ہے؟

(۱۳)

یہ ایک سوال ہے، جو ابتدائے آفرینش سے کیا جا رہا ہے۔ جس کا کوئی تسلی بخش جواب صدیاں گذر جانے کے باوجود ابھی تک نہ مل سکا۔ یہ ایک معمہ ہے جو اس تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی اسی طرح لاینحل ہے جس طرح دنیا کی پیدائش کے وقت تھا۔ یہ ایک راز ہے جس کے انکشاف سے دنیا کے بڑے بڑے مخترعین عاجز ہیں۔

تمدن جدید و قدیم کے صدہا دور اس پر آئے اور گذر گئے۔ مگر فلسفہ عشق و محبت جس طرح روز اول ایک چیستان تھا، اسی طرح آج بھی ہے۔ زمانہ قدیم و جدید کے فلاسفر اس کی تحقیقات سے عاجز رہے۔ کسی نے اس کو مرض بتا کر اپنی کم مائگی کو چھپایا۔ کسی نے جنون سے تشبیہہ دے کر اپنے افلاس دماغی کا نشر و اعلان کیا۔

ایک شعرا کی جماعت ہے۔ جس کی محلس ادب لفظ عشق کے دم سے زندہ اور پُر رونق ہے۔ سنئے ایک ایشائی شاعر عشق کی تعریف کس قدر سادے الفاظ میں کر کے اپنی بے بضاعتی کا اظہار کرتا ہے

"عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پوچھا چاہیئے

ہندوستان کا مشہور فلسفی شاعر (غالب) عشق کی تعریف کیسے درد بھرے الفاظ میں کرتا ہے۔

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!

ہندوستان کا مشہور روحانی شاعر ٹیگور ایک نئے پیرایہ میں عشق کی تفسیر بیان کرتا ہے۔

"سزا دینے کا حق صرف اُس کو ہے جو محبّت کرتا ہے۔"

اس کے بالمقابل مغربی شعراء اور فلاسفر عشق کی تعریف میں کیسے پاکیزہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی بھی سنئے۔

انگلستان کا مایۂ ناز شاعر شکسپیئر عشق و محبت کے فسانہ کو کتنے اچھے الفاظ میں ادا کرتا ہے۔

"محبت آنکھوں سے نہیں، بلکہ دل سے دیکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ عشق کا دیوتا اندھا ہوتا ہے۔"

انگلستان کا دوسرا مشہور فلسفی شاعر ملٹن عشق کا فلسفہ کتنے مختصر الفاظ میں کس قدر دفور جذبات سے متاثر ہو کر مستانہ وار الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"عشق خدا ہے اور خدا عشق"

ایک دوسرا مغربی اہلِ قلم کہتا ہے کہ:۔

"عشق کی زبان آنکھوں میں ہے۔"

ایک اور یورپ کا مایۂ ناز فرزند عشق کی یہ تعریف بتاتا ہے۔

"خدا محبت ہے"

غرضکہ تمام دنیا کے اہلِ قلم، حکمار، فلاسفر، شعرار، اور اربابِ ذوق، عشق کی تحقیق میں کسی ایک مرکز پر جمع نہیں ہوئے۔

اختلافِ خیال، تصادم آرا محققین عشق کا حقیقی سرمایۂ حیات ہیں۔ خیال کی یک جہتی عشق کے فلسفہ کو بیان کرنے والوں میں مفقود نظر آتی ہے۔

ایک جماعت طبقۂ متصوفین کی بھی ہے۔ جو عشق کو منزل کی حقیقت کی پہلی سیڑھی بتاتی ہے۔ اس کے نزدیک انسانیت کی تکمیل کا انحصار عشق پر ہے جب طالبِ حق کے دل و جگر میں کسی کے لئے ٹیس نہ ہو، آنکھیں کسی کی دید کے لئے ترنم ریز نہ ہوں اس کو انسانیت سے واسطہ کیا؟

عشق ایک آتشکدہ ہے، جہاں عقل و خرد، دل و دین، ہوش و حواس سب کی بھینٹ قربان گاہِ حسن پر چڑھانی پڑتی ہے۔ پھر اگر اس کے بعد بھی آتشکدہ میں گرمی پیدا نہ ہو تو عشق و محبت کی آگ کو دامن سے ہوا دے کر متاعِ انسانی کی محبوب ترین شے آزادی کو بھی کیوپڈ کے تیر کی بھٹی میں ڈال دینی پڑتی ہے۔ اس جماعت کے جذبات کی ترجمانی بلبلِ شیراز اس طرح کرتے ہیں :-

ترکِ مال و ترکِ جاں و ترکِ سر!
در طریقِ عشق اول منزل است

اللہ اللہ جس کوچے میں قدم رکھنے کے لئے پہلی منزل اس قدر کٹھن ہو۔ وہاں آج دیکھتا ہوں کہ ہر وہ جاہل جس کی آنکھ کھل سکتی ہے اور دہن سے ایک بے محابا آہ نکل سکتی ہے، مجمع عشاق میں شامل ہو جاتا ہے اور اپنی بوالہوسی کا شکار مقدس عشق کی خندق میں بیٹھ کر کرنا چاہتا ہے

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

صوفیائے کرام نے کہا ہے کہ انسان کا دل جب تک چوٹ نہ کھائے دنیا کی لذتوں کو نہیں چھوڑتا، اور یہ چوٹ صرف عشق ہی کے ہاتھوں لگ سکتی ہے عشق ہی کا فرشتہ حُسنِ مجازی کی سرکار میں اپنے طاقتور ہاتھوں سے بڑے بڑے مغرور انسانوں کے سر نیچے کر دیتا ہے عشق ہی کے دیوتا نے دنیا کے زبردست فاتحوں کا حُسن کے ناقابلِ تسخیر قلعہ کی دیواروں سے سر ٹکرایا ہے۔ یہ عشق ہی ہے جس کے آگے بہادر سے بہادر انسان ایک نظر ملاتے ہی ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

ایک جماعت علماء کی بھی ہے۔ جن کی عبادت کی تنہا امید گاہ حور و غلمان ہوتے ہیں۔ جو اپنی مسجدوں اور حجروں میں دوست کو تلاش کرتے ہیں۔ جن کا خشک دل و دماغ بھی تلاشِ محبوب کا تصور کئے بغیر نہیں رہتا

حور و جنّت جلوہ بر زاہد دہد در راہِ دوست!
اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

جس طرح برسات میں شمع کے گرد پروانوں کے ساتھ ٹڈے شامل ہو کر دعوئے عشق پرستی کرتے ہیں اور فداکاری و سرفروشی کے وقت راہِ فرار اختیار کرتے ہیں، اسی طرح اس مقدّس پیشہ (عشق) کو بعض بوالہوسوں نے بدنام و رسوا کر دیا ہے۔

پس ضرورت ہی نہیں بلکہ اشد ضرورت ہے کہ عشاق پیشہ جماعت کے سربرآوردہ حضرات اپنی برادری کی تنظیم کے لئے کھڑے ہوں۔ اور ایسے بوالہوسوں کو اپنی محترم و مقدس جماعت سے علیحدہ کر کے اپنی جماعتی تقدس کے احترام کے لئے مرداشہ وار تیار رہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اب دنیا عشق میں قیس و فرہاد، سعدیؒ و خسروؒ پیدا نہ ہوں گے۔ مگر کم سے کم یہ ضرور ہوگا کہ نفس پرستوں، بوالہوسوں، اور ایک سچی تڑپ رکھنے والوں میں امتیاز ہوگا، جس کی اشد ترین ضرورت ہے۔

(آرٹ۔ جنوری ۱۹۳۸ء)

غالب کی شاعری

(۲)

غالب پر تنقید کرنے والے ایک اصولی غلطی میں پڑ کر اکثر راستہ سے الگ ہٹ جاتے ہیں۔ کوئی الفاظ کی اُلجھنوں میں پڑ کر لغات و محاورات کی جانچ کرنے لگتا ہے تو کوئی فلسفہ و الہٰیات کے مناظروں میں پھنس کر منزل سے بہت دُور چلا جاتا ہے۔ اور غالب کی شاعری کا وہ اصل عنصر جس نے اردو شاعری کی تاریخ میں اُسے ممتاز ترین جگہ دی۔ نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ انسان کے جذبات اور تخیلات میں اتنی وسعت ہے کہ زبان و قلم سے ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ اور مصور کے قلم کا ایک لفظ یا لکھنے والے کے چند الفاظ ایک مقالہ کا مضمون ادا کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں ایک مصور یا شاعر کے ہنر کو جانچنے کے لئے نقاد کی وسعتِ نظر بھی ضروری ہے۔ فنونِ لطیفہ کا اصل مقصد جذبات لطیفہ میں اُبھار پیدا کرنا ہے۔ لیکن اس کے اثر کو قبول کرنے کے لئے فن کے نکات سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ ورنہ ایک بے علم کے سامنے رقص و سرود محض مجنونانہ حرکات یا جذبات اسفل کے اُکسانے والے حربے نظر آئیں گے۔ مصوری میں وہ خطوط و نقاط کی معنویت کو سمجھ نہ سکے گا۔ اور شاعری میں الفاظ کی اس تہ کو نہ پہونچ سکے گا، جہاں شاعر

کے جذبات وتخیلات مستور رہیں۔

اس نقطۂ نظر سے غالب کی شاعری پر نظر ڈالنے کے لئے ہمیں صرف ایک اصول پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ مشاہداتِ عالم سے شاعر کے دل پر جو تاثرات پیدا ہوئے اُن کے اظہار میں اس کے اندازِ بیان نے کس حد تک ساتھ دیا۔ یہ تاثرات صحیح تھے یا غلط اسکی بحث شاعری کی تنقید کے دائرے سے باہر ہے۔ شاعر کا کام محض جذبات وتخیلات کی مصوری ہے۔ اور اُن کی صحت یا عدم صحت اس کا کام نہیں ہے۔ مثلاً ایک پیکرِ خاکی کو دیکھکر شاعر اس کے خد وخال کے حُسن پر نظر ڈالتا ہے اور مختلف کیفیات اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ انہی کیفیات کو وہ الفاظ کا جامہ پہنا کر شعر میں منتقل کر دیتا ہے۔ اب نقاد کا کام صرف اس قدر رہے کہ وہ یہ دیکھے کہ ان الفاظ نے اندرونی کیفیات کے اظہار میں کہاں تک ساتھ دیا۔ اور جو نقشہ پڑھنے یا سننے والے کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ شاعر کے اصلی جذبات سے کس حد تک مشابہ یا مطابق ہے۔ اب اگر ہم ان جذبات کے حُسن و قبح کی بحث میں پڑ جائیں تو اصل مقصد سے بہت دُور جا پڑیں گے۔ اور ہماری تنقید شاعری کی بحث کے دائرے سے نکل کر منطق و فلسفہ وغیرہ کے حدود میں پہونچ جائے گی۔

اب میں غالب کے چند اشعار آپ کی خدمت میں پیش کر کے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جذبات وتخیلات کی مصوری میں اس شاعر کو کس درجہ

کمال حاصل ہے۔ اور کیوں اسے اپنے معاصرین ہی میں نہیں بلکہ متقدمین اور متاخرین میں بھی اعلیٰ امتیاز حاصل ہے۔

ایک انسان کو دیکھ کر انسان کے دل میں طرح طرح کے خیالات آتے ہیں۔ قدرت کی کاری گری، تخلیق کا کمال، اختیار و بے اختیاری، سرفرازی و عاجزی وغیرہ وغیرہ ان سب کی تشریح واضح طور پر لکھی جائے تو دفتر کے دفتر ہو جائیں۔ اور بیان تشنہ رہ جائے۔ شاعر ان تمام تخیلات و جذبات کو چند الفاظ میں ادا کرنا چاہتا ہے۔ اور غالب نے اسمیں جو کمال دکھایا ہے وہ اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ کہتا ہے کہ

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

چند مختصر الفاظ میں اتنے جذبات و تخیلات کو بھر دینا دریا کو کوزہ میں بند کر دینا ہے۔ اور غالب کے انداز بیان کی یہ قدرت حالی و ماغنی کے شعرا میں خال ہی خال نظر آتی ہے۔

جس وقت دماغ پر کسی سخت تشویش یا تفکر کا تسلط ہو اُس وقت ایک لمحہ گزرنا کس حد تک دشوار ہوتا ہے۔ اور روحانی تکلیف و جذبات کی گہرائی کے اعتبار سے بڑھتی جاتی ہے۔ اس اندرونی کیفیت کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے لیکن غالب کا اندازِ بیان سب سے جداگانہ ہے۔ کہتا ہے کہ

کاؤ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جُوئے شیر کا

احساسات کی ولولہ انگیز تصویر کے ساتھ الفاظ کی مناسبت. زبان کی لطافت اور صبح "جوئے شیر" کی موانست غالب ہی کا حصہ ہے۔

غم والم کی بے پایاں تاریکیوں میں محصور ہو کر ایک انسان اپنے مستقبل پر جس مایوسی اور بے بسی کے ساتھ نظر ڈالتا ہے۔ وہ ہر دردمند شخص جانتا ہے. لیکن اس کے اظہار کی قدرت سب کو نہیں ہوتی۔ اور غالب نے جس انداز سے اس کیفیت کو بیان کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ کہتا ہے۔

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

ایک ایک لفظ کی شرح میں کتابیں کی کتابیں لکھتے چلے جایئے لیکن "ہنوز" "گیا" اور "تھا" کی معنویت کا پورا احاطہ نہ ہو سکے گا۔

مصیبت کے وقت جب دوست دشمن ہو جاتے ہیں اور انسان مایوس ہو کر خود اپنے اوپر کبھی بھروسا نہیں کرتا تو اس کیفیت کے اظہار میں الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ لیکن غالب کا کمال یہ ہے کہ اس نے چند سادے اور مختصر الفاظ میں اس کا بھی صحیح نقشہ کھینچ دیا ہے۔—— کہتا ہے کہ

دوست دار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالۂ نارسا پایا

غالب کے شارحوں نے اس شعر کو رومان کے دائرے میں دھکیل کر

اس کی سخت توہین کی ہے۔

کسی طاقتور جذبہ کا غلبہ انسان کو غیر معمولی طور پر ذی حس بنا دیتا ہے۔ اور ہمدردی کے الفاظ بھی اس کے دل پر تیر و نشتر بن کر لگتے ہیں۔ اس کیفیت کو بھی غالب نے جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ کہتا ہے کہ

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

ایک اور جگہ ہجومِ غم کی اضطراری کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ کہ دنیائے شاعری میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کہتا ہے کہ:۔

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

دوسرے مصرعہ سے جو تصویر پیدا ہوتی ہے اس کے خد و خال کی باریکیاں کچھ وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو اس کیفیت سے کبھی دوچار ہوئے ہوں اور علم و ذہن کی روشنی رکھتے ہوں۔

موانست اور تعلق کا درجہ ایک یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے مقصود سے اپنے کو بالکل وابستہ دیکھتا ہے۔ اور دونوں کا فرق امتیاز مٹ جاتا ہے۔ فلسفہ یا الہیات میں اس جذبہ کی تشریح کیوں کر کی گئی یہ تنقید شعر کی حد سے باہر بات ہے۔ ہمیں یہاں صرف یہ دیکھنا ہے کہ شاعر کے دل میں ایسے وقت جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اُس کی تصویر کس حد تک

صحیح کھینچی گئی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ :۔

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

"ہمارا پوچھنا کیا" سے جس قلبی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے وہ کسی دوسری طرح ادا نہیں ہو سکتا اور یہی غالب کی شاعری کا کمال ہے۔

اسی مضمون کو ایک دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے کہ

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اس طنزیہ لہجہ نے جو معنویت پیدا کی ہے اس کے دیکھنے کے لئے بھی "دیدۂ بینا" کی ضرورت ہے۔

حوصلہ کی فراوانی جس وقت انسان کو اپنی بے مائگی کا احساس کراتی ہے تو ایک خاص کیفیت دل میں محسوس ہوتی ہے۔ جو الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ غالب کہتا ہے۔

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا!
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اس شعر سے جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ خد و خال کی جاذبیت اور اصل سے مماثلت کے لحاظ سے قابلِ داد ہے۔

امید و یاس کی مختلف کیفیات اور اُن سے پیدا ہونے والے جذبات شعراء کی جولانیوں کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کرتے ہیں۔

لیکن ان کے اظہار پر قدرت ہر شخص کو یکساں نہیں ہوتی۔ غالب نے اس کیفیت کو اس طرح سے بیان کیا ہے۔ اور ہر جگہ ندرت اور بلند پروازی کی شان دکھائی ہے۔ کہتا ہے کہ

یاس امید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجز ہمت نے طلسم دلِ سائل باندھا

یہ ایک خوددار انسان کا جذبہ ہے جو سوال کو کم ہمتی سمجھتا ہے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

اس میں مایوسی کے ایک درجے کا نقشہ کھینچا ہے۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

مایوسی کے ایک اور درجہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ کو ناخن گرہ کشا تھا

یہ ایک تیسرے درجہ کی کیفیت ظاہر کر رہا ہے۔

غرضکہ اسی قسم کے پچاسوں اشعار انتخاب کئے جا سکتے ہیں جسمیں شعر و بیان کے کمال کا بدرجہ اتم اظہار کیا گیا ہے۔ متذکرہ بالا اشعار محض چند اوراق پر سرسری نظر ڈال کر منتخب کئے گئے ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے زیادہ فرصت اور وقت درکار ہے۔

اردو کا میدان غالب کا دائرۂ عمل تھا۔ اور اس کی فلاح وبہبود وحفاظت وترقی سے اس کی روح کو سب سے زیادہ خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اس کے نام کو زندۂ جاوید رکھ سکتی ہے۔ اگر اردو زبان یا دمخالف کے جھونکوں سے فنا ہو گئی تو غالب کا نام لیوا بھی دنیا میں کوئی نہ رہے گا۔

(پیشوا ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ)

عورت دنیا میں کیوں آئی؟

(۳۴)

یہ ایک سوال ہے جو شائستہ دماغوں کو اپنی طرف عرصہ سے متوجہ کئے ہوئے ہے۔ اور اس کا ایک اور صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ عورت محبت کی چیز ہے۔ اور وہ دنیا میں صرف محبت کے لئے آئی ہے

عورت ایک مقناطیسی کشش ہے جو اپنے چاہنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور کبھی کبھی خود بھی کھنچی چلی آتی ہے اور وہ اپنی فطری نزاکت کی وجہ سے کسی کی دوشِ محبت کا سہارا چاہتی ہے۔ کیونکہ عورت دنیا میں کسی سے محبت کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

عورت محبت پر جان دیتی ہے اور جب وہ آغوشِ محبت میں پھولوں کی سیج پر ہو تو دنیا کے تمام افکار بھلا دیتی ہے۔ کہ وہ خود کسی کے گلے کا ہار بننے کے لئے دنیا میں آئی ہے۔

عورت کی ساری زندگی اور عورت کے وسیع ترین تخیل کی بسیط دنیا حسن و عشق کا ایک مکمل فسانہ ہے۔ جس میں عورت یا تو خود کسی کی محبت میں فنا ہو گی اور یا کوئی اور اس پر جان دیتا ہو گا۔ اگرچہ عورت پھنستی ذرا مشکل سے ہے مگر پھنسنے کے بعد نکلنے کا نام نہیں لیتی۔ اور اسے خود نہیں معلوم ہوتا کہ شکار کرنے سے پیشتر وہ خود شکار ہو چکی ہے۔ دوسروں کو

شکار کرنا اور خود شکار ہونا اُس کی زندگی کا مقصد وحید ہے۔

عورت کتنے ہی پاکیزہ جذبات کی حامل ہو اس خیال سے خالی نہیں ہوتی کہ اس کی کافرادائیں، اس کی فتوحات اس کا سرمایۂ نشاط ہیں جن سے اس کے دل کو راحت ہوتی ہے اور ان آلاتِ جنگ سے وہ دم واپسیں تک کبھی دستبردار نہیں ہوتی۔

عورت اپنے شانے سے کبھی آنچل خود نہیں گراتی۔ مگر جب آنچل گر جاتا ہے تو سینہ کا جائزہ لے کر دل ہی دل میں خوش ہوتی ہے کہ اسکو دوہرائے ہوئے آنچل میں سینہ کا اُبھار غائب کرنا منظور نہیں۔

عورت ہزار بار پارسا ہو لیکن وہ محرم کے جائزۂ نظری کو حُسن کی صحیح داد سمجھتی ہے۔ اور جوانی کی زیبائشوں میں چھپے ہوئے قیدیوں کو جو "عورت کے ارمانِ مجسّم" ہیں دیکھنا پسند کرتی ہے۔

حُسن کا معیار کبھی متفق علیہ نہیں رہا۔ لیکن عورت کے "مقیاس الشباب" پر دائرۂ حُسن میں کبھی اختلاف رائے نہیں ہوا اور یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اس کو انسانیت سے بلند و برتر کرتی ہے

عورت بہترین عطیۂ فطرت ہے۔ اور اس میں کالی گوری کی کوئی خصوصیت نہیں۔ صرف جوانی کے آلۂ حرب سے مسلح ہونے کی ضرورت ہے۔ اور پھر اس کے لئے فتوحات کا دروازہ کھلا ہوا ہوگا۔ اور کائنات اس کے قدموں پر ہوگی۔

عورت اگر کبھی محرم کے بند کھینچکر باندھے تو سمجھ لیجئے کہ آج قیامت

برپا ہو کر رہے گی۔ اور کوئی خوش نصیب زد پر ضرور آئے گا جس کے لئے یہ سینہ پر دو پایہ کو رکھنا چاہتی ہے۔ اور یہی شغل اس کی تخلیق کا باعث ہے۔ "شراب دو آتشہ" اور وہ بھی شباب کی، جب کھنچ کر قدرتی کنٹرول میں بھری ہو تو کوئی فرشتہ ہی ہوگا جو مستی اور بے خودی کے مجسموں کا دلدادہ نہ ہوگا۔ ذرا فطرت کی شوخی دیکھئے کہ اس فتنۂ قیامت زا کے لئے جگہ نکالی بھی تو کہاں؟

عورت انسانی زندگی کے ہر صیغہ کو مس کرنے کے لئے عالم وجود میں آئی ہے۔ اس کے خیال میں آرزوئے وصل جس پر ہمارے شعراء مرد شغفتے ہیں۔ نری حیوانیت ہے۔ اور وہ کبھی کبھی خوش عیشی کے مقابلہ میں فلسفۂ ناکامی کو زیادہ پسند کرتی ہے۔

غرضکہ عورت زندگی کے صحیفہ کی تفسیر ہے جو اس لئے دنیا میں آئی ہے۔ کہ جھونپڑے کو شیش محل بنا دے اور اس میں جانوروں کو انسان بنانے اور انسانوں کو جانور بنانے کی قابلیت موجود ہے۔

کسی بڑے سے بڑے ایوانِ عیش کی تکمیل اُس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک عورت کا ہاتھ اس بزمِ آرائش میں شامل نہ ہو کہ یہی اس کی تخلیق کا منشا ہے۔ اور فطرت اور تسخیر کی خواہش بھی یہی ہے کہ کارہ یار عالم میں اس کو دنیا کے بلند ترین مقام پر دیکھئے۔

عورت کیا ہے؟

(لہری)

عورت کیا ہے ایک عالمِ نور کی سیر کرنے والی شہزادی۔ ایک نور پاش شفاف خراماں پیکرِ آتش۔ ایک بے خبر مصروفِ تماشا تو رنگی تتلی، ایک تبسّم خاندان۔ ایک تفریح ضیا۔ ایک سرودِ محبت، ایک برقِ منتشر۔ ایک انجذابِ مضطر۔ ایک نزہت بارِ زندگی۔ ایک سنبلِ معطر۔ ایک مسحورِ روحِ لرزاں۔ ایک شعلۂ جوالہ نگاہ۔ ایک برق پاش نگاہ، ایک حیات سوز اور جگر دوز نظر۔ ایک آبگینۂ الفت۔ ایک خرامِ وقار، ایک خندۂ سیال۔ ایک شانِ بیخبری۔ ایک عطر بیز کلی۔ ایک روح پرور غنچۂ ناشگفتہ۔ ایک پیکرِ سعادت۔ ایک سراپا محبت۔ ایک سرتاسر معصومیت۔ ایک موسیقی خراماں۔ ایک نقرئی آواز والی دوشیزہ۔ ایک بلوریں کلائی والی پیکرِ ناز۔ ایک گوری گوری گردن والی حسینہ۔ ایک یاسمینی شباب والی گلِ رعنا۔ عورت کیا ہے؟ دنیا کے بنی نوع انسان کی ماں ہے۔ زندگی کی رزم اور بزم میں مکانوں کے تاریک کمروں میں ملوں کے شور و غل میں بازارِ تجارت کے ہنگاموں میں اور تھیئٹروں کے اسٹیجوں کی رونق ہے۔ عورت کیا ہے؟ رحمدلی اور نرم مزاجی کا مجسمہ اور صبر و شکر کی زندہ تصویر ہے حُسنِ سیرت اور حُسنِ صورت کا لہریں مارتا ہوا ایسا دریا جس کی روانی میں کبھی کمی نہیں آتی۔ غرضکہ عورت کی مختصر تعریف یہ ہے کہ وہ خود عورت ہے

اور عورت دیباچۂ کائنات ہے۔

محبت ایک پاک اور بے غرض جذبہ ہے جو انسانی زندگی کے لوازمات میں سے ہے۔ لیکن محبت کی رمز شناس اور صحیح قدردان عورت اور صرف عورت ہی ہو سکتی ہے۔ جس کی زندگی کا مآل کار صرف محبت ہے

عورت مرد کی خواہشات کی تکمیل کا صرف آلہ نہیں ہے بلکہ عورت گھر کی ملکہ ہے۔ نیک دل حاکم ہے۔ اطاعت شعار محکوم اور غمگسار شریک زندگی ہے۔ عورت بچوں کی وہ ماں ہے جس کی آغوشِ شفقت اپنے بچوں کے لئے ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ ہاں عورت اور صرف عورت ہی ہے۔ جو جوانی کی راحت اور بڑھاپے کی وفادار رفیق ہوتی ہے اور ہاں ہاں صرف عورت ہی بیماری میں شریف ترین تیماردار اور مصیبت میں سچی وفادار اور غمگسار ثابت ہوتی ہے۔

عورت نے کائنات کے سب سے پہلے انسان کو اپنے وجود سے تسکین دی۔ اور اپنے بطن سے ایسے ایسے نامور فاتح، دیوتا، اوتار۔ پیغامبر اور رشی منی پیدا کئے۔ جن پر کائنات اور اقوام عالم کو ناز ہے اور یہ بدنصیب عورت ہی ہے جو صدیوں تک مذاہبِ عالم کے ہر حصہ میں باوجود ایسی شاندار قربانیوں کے قابلِ نفرت و ملامت قرار دی گئی ہے عورت نے اپنے وجود اور اپنے حیرت انگیز کارناموں سے اس کارزار ہستی کو چار چاند لگائے جس کی زینت خود عورت کی رہینِ منت ہے۔

عورت پیغمبرِ عالم کی بعثت سے پہلے دنیا کی ایک بد ترین لعنت تھی۔

غیور عرب اس کو زندہ درگور کر دینا ہی باعثِ فلاح سمجھتے تھے۔ یورپ میں عورت کا وجود باپ اور خاوند میں مدغم ہو گیا۔ ہندوستان میں شوہر کے ساتھ زندہ آگ میں جل کر راکھ ہو جانا عورت کے فرائض میں شمار کیا گیا۔ اور اس کے بعد اس کا کوئی ورثہ نہ تھا۔

انگلستان کے مشہور فلاسفر لوتھر نے عورت کی یہ تعریف کی ہے کہ "سب سے بڑی نعمت جو انسان کو حاصل ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اُسے نیک اور پارسا بیوی ملے جس کے ساتھ مرد امن اور چین کے ساتھ زندگی بسر کر سکے"۔

عورت حُسنِ قدرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جس کا تعلق انسانی نسل کے کسی مخصوص طبقہ سے نہیں اور میرے خیال میں حُسن کی پیدائش کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ مَردوں کو متاثر کرے۔

یورپ و امریکہ میں عورت کا حُسن اپنا یہ مقصد پورا کر رہا ہے۔ مغرب کی روزمرہ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہاں کے مرد محض عورتوں کے طفیل مایوس و ناکام نہیں ہوتے۔ دن بھر کی دماغی اور جسمانی محنت کی تھکاوٹ حسین عورت کے خفیف ترین تبسّم سے دُور ہو جاتی ہے۔ اور پژمردہ مزدور۔ متفکّر فلاسفر۔ مصروف دوکاندار۔ پریشان سرمایہ دار سب ہی اپنی تفریح کے لئے عورت کے رہینِ منت ہیں۔

ابھی تھوڑا عرصہ گذرا کہ ۱۹۱۳ء میں یورپ کی ایک مشہور ترین رقاصہ ہندوستان میں اپنے حُسنِ عریاں کا نظارہ دکھانے آئی تھی۔ جس نے

دیکھا کہ مذہبی دنیا کے اس طبقہ کے اکثر افراد جو یورپ کی آزادی کے نام سے گھنٹوں پر ہاتھ دھرنے تھے قیمتی سے قیمتی ٹکٹ خرید کر اس مغربی رقاصہ کے حُسنِ عریاں کا نظارہ پیہم منہ پر رومال رکھ کر اور بعض لاحول پڑھ کر کیا کرتے تھے۔ اور یہ مغربی رقاصہ جس کو دیکھتے وقت اکثر ہندوستانیوں کا کلیجہ دہک دھک کیا کرتا ہوتا اپنے کہربائی جسم یا "شئے عورت" کو ساڑی یا ساڑھی سے چھپانے کے بجائے چار انگل کی موتیوں کی چلمن کا رہین منت بنا یا کرتی تھی اور اس نظارۂ حیا سوز اور کفر آگیں تفریحی مقام کو دیکھنے کے واسطے ایسے ایسے متقطع حضرات جاتے تھے کہ جو عورت کے نام پر تبرّا بھیجنا اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔

عورت کی تربیت

دنیا میں مشکل ترین کام اگر کوئی ہے تو وہ عورت کی تربیت ہے جس پر نظام عالم کا اگر انحصار نہیں ہے تو اقوام عالم کی ترقی کا انحصار ضرور ہے عورت کا کام صرف اولاد ہی پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے گھر کی خود مختار ملکہ ہے۔ اپنے خاوند کی رفیق ترین شریک زندگی ہے۔ اپنے بچوں کی شفیق ترین ماں ہے۔ اپنے پڑوسیوں کی ہمدرد ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ عورت کی تربیت سے قوموں کا انقلاب وابستہ ہے۔

اگر عورت کی تربیت کے وقت مذکورہ امور کا خیال رکھا گیا تو وہ اپنی ملت اور اپنے ملک کے لئے کارآمد ثابت ہو گی۔ ورنہ عورت کی

تربیت کا نقص قوموں اور ملکوں کی تباہی کا موجب ہوا کرتا ہے کیونکہ جب عورت کی تربیت اچھی نہ ہوگی تو وہ فرمانبردار اولاد اطاعت شعار بیوی، شفیق ماں اور شریف شہری کیوں کر بن سکے گی۔ اور اس کے بعد اس کی آغوش سے ایسی ناتربیت یافتہ اولاد پیدا ہوگی جس کا اثر آئندہ نسلوں کی تباہی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہر ملت کے افراد عورت کی تربیت میں خصوصیت کے ساتھ کوشاں ہوں جس کا بار مرد کی تربیت سے کم پڑتا ہے۔ اس لئے ان عورتوں کی تربیت پر بہت زیادہ زور دینا چاہیئے۔ جو آج لڑکیاں ہیں وہ کل مائیں ہوں گی اور اُن کی آغوش میں قوم کے نونہال پروان چڑھیں گے۔

عورت کے توہمات

عورت توہم پرستی کا مجموعہ ہے۔ اور اس میں کچھ مشرق و مغرب کا امتیاز نہیں۔ وہ جانوروں کے بولنے سے شگون لیتی ہے۔ وہ جسم کے کسی حصہ کے پھڑکنے سے بھی شگون لیتی ہے۔ غرضکہ فطرت کا مطالعہ کرنے والی عورت توہم پرستی کی ایک وسیع ترین دنیا اپنے اندر رکھتی ہے۔ میں چاہوں تو بہت سی مثالیں اس کی توہم پرستی کی بیان کرسکتا ہوں۔ مگر یہ تحریر طویل ہو جائے گی۔ اس لئے صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

میں اپنے ایک ایسے مشرقی دوست کے ہاں بیٹھا ہوا تھا کہ جن کی اہلیہ کی تربیت بالکل مغربی طرز پر ہوئی تھی۔ اس لئے کہ ان میں اور ایک

یورپین عورت میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس قسم کے لوگوں کو مذہب سے جو واسطہ رہا کرتا ہے اس کی تشریح غیر ضروری ہے۔ میری موجودگی میں خاتون محترم کے پاس ان کا چھ سالہ بچہ آیا اور اپنے ماسٹر کے پاس جانے کی اجازت چاہی۔ ماں نے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا کہ آج کیا دن ہے جواب میں جمعرات سن کر گھبرا گئیں۔ اور کہا کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اس روز بیت اللحم میں ہزاروں ننھے ننھے بچوں کا خون بہایا گیا۔ میں ایسے منحوس خونی دن میں کبھی تمہارے پڑھنے کی ابتدا نہ ہونے دوں گی۔ میں نے دریافت کیا کہ مغربی تعلیم اور مشرقی توہمات میں کوئی رشتہ ہے؟

ایک دوسرا واقعہ میری ایک رشتہ دار خاتون کا ہے جو باوجود مذہبی پابندیوں کے قائل ہونے کے ایک روز میرے سامنے اپنا وصیت نامہ لکھنے بیٹھ گئیں۔ کیونکہ محلہ کے کتّے نے ان کے مکان پر ایک خاص قسم سے بھونکنا شروع کر دیا تھا جس کی آواز کو انھوں نے پیام موت یقین کیا۔

خود میری زندگی میں توہم پرستی کے بہت سے مناظر گذر چکے ہیں۔ جن کو عورت اپنی فطری کمزوری کی وجہ سے بہت جلد قبول کر لیتی ہے۔

عورت کی معصومیت

عورت باوجود انتہائی جرم کے ارتکاب کے بعد بھی اپنے تئیں

معصومیت میں فرشتے سے کچھ زیادہ ہی سمجھتی ہے۔ جس کی چند مثالیں درج کرتا ہوں۔

مشہور فرانسیسی مصنف مسٹر کیتھل اُمنٹڈس اپنا ایک چشم دید واقعہ لکھتا ہے کہ موسیو کرسٹل کو اپنی عورت کے چال چلن پر شبہ ہوا اور اُس نے سختی سے اپنی اہلیہ کی نگرانی شروع کی۔ ایک روز اپنی عصمت مآب اور معصوم اہلیہ کو اس حالت میں جا پکڑا کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ "فرینڈ شپ" میں مصروف تھی۔ موسیو کرسٹل اپنی "عفت مآب" اہلیہ کے کمرے میں درانہ گھسا اور اس نے دیکھا کہ ایک کونٹ برہنگی کی حالت میں کھڑکی سے کود کر بھاگا اور اس کی اہلیہ کمرے میں برہنہ مگر مطلق پریشان نہ تھی۔

مسز کرسٹل سے دریافت کیا گیا کہ جو شخص کھڑکی سے کودا ہے وہ کون تھا تو اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ میں نے اس شخص کو نہیں دیکھا۔ ممکن ہے کوئی چوری کے ارادے سے آیا ہو اور موقعہ نہ ملنے پر بھاگ گیا ہو۔ جب کپڑے کے متعلق دریافت کیا گیا کہ کس کا ہے تو فرمانے لگیں کہ میری ایک خاتون دوست کا ہے۔ موسیو نے اس کی اس جگہ موجودگی کی وجہ دریافت کی تو کہا اچانک میری طبیعت خراب ہو گئی اور میں آرام کرنے لیٹ گئی۔ اس کے بعد موسیو نے زنانہ کمرے میں مردانہ کپڑوں کی موجودگی کی وجہ دریافت کی تو اس کی بیوی نے حیرت سے موسیو کا منھ دیکھ کر کہا کہ میں نے اب سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یہ یقیناً

میری دوست خاتون کے کسی مرد دوست کے کپڑے ہوں گے۔ ان حقائق کے بعد وہ غصہ سے بے قابو ہو گئی کہ اس کی نسبت ایسا کمینہ شبہ کیوں کیا جاتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کو اپنی بے گناہی کا اس درجہ یقین تھا کہ وہ اس واقعہ کے تصور سے دیوانی ہوئی جاتی تھی۔

ایک فرانسیسی اہلِ قلم عورت کی مفروضہ معصومیت پر حسبِ ذیل خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ "عورت کسی حال میں بھی تصور نہیں کر سکتی کہ اُس نے اپنے شوہر کی امانت میں خیانت کی ہے۔ یا عفت کے دائرے سے اس کا قدم ایک انچ بھی ہٹا ہے۔ اگرچہ آسمان کے فرشتے اپنی تمام معصومیتوں کے ساتھ اس کے جرائم کی شہادت دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔

اگر تم عورت کو ارتکاب جرم کے وقت گرفتار بھی کر لو تو بھی وہ غصہ اور حیرت سے چلّا اُٹھے گی۔ کہ کون مجھ پر تہمت لگا سکتا ہے۔ عورت یہ ریاکاری سے نہیں کہتی۔ اگر تم اُسے مکار سمجھتے ہو تو یقین کر لو کہ تم عورت کی فطرت سے ناواقف ہو۔ بلکہ اس کا احساس ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ معصوم ہے۔ اس نیلگوں آسمان کے نیچے عورت کی فطرت سے زیادہ مشکل، اور عجیب تر کوئی چیز نہیں۔ اگر تم زن مرید ہو اور تم کو میری بات کا یقین نہیں آتا تو بسم اللہ خود تجربہ کر لو۔ کسی پیشہ ور طوائف کے مکان پر چلے جاؤ وہ اپنے تئیں کنواری مریم سے زیادہ معصوم ثابت کرے گی اپنی سوسائٹی کی خدمت کرے گی۔ اپنے طوائف ہونے کا الزام اپنے والدین پر

ڈالے گی۔ یا اپنے کسی آشنا کو ملامت کرے گی جس سے وہ اپنا منہ کالا کرچکی ہے۔ مگر خود اپنے تئیں قابلِ ملامت نہ سمجھے گی۔ اس لئے کہ سب نے اُسے گرانے کی کوشش کی۔ مگر وہ اب تک اپنے تئیں سراپا عصمت کا پُتلا سمجھتی ہے۔ اگرچہ اس کا پیشہ عصمت فروشی ہے۔ مگر گیا وہ اس کی قائل بھی ہے۔

اگر بدقسمتی سے تم کسی بازاری عورت کے پھندے میں پھنس گئے ہو تو وہی عورت جس کی "عصمت باختگی" کا تم کو ذاتی طور پر تجربہ ہے کسی شتبہ موقع پر اگر کبھی اپنی غلطی سے تمہاری گرفت میں آئے گی تو تمہارا اعتراض سنتے ہی چراغ پا ہو جائے گی کہ وہ اپنے تئیں معصوم سمجھتی ہے۔

ایک بدترین آوارہ اور پیشہ ور عورت جب کبھی اپنے حسن کی داد شیشہ دیکھکر دینے سے فارغ ہوتی ہے تو بے اختیار چیخ اُٹھتی ہے کہ "الٰہی یہ تیرے فرشتے کی صورت ہے۔

تجربے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ عورت جتنی زیادہ اخلاقی حیثیت سے گرتی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ وہ اپنے تئیں معصوم بھی سمجھتی ہے۔ اور وہ اپنی عفت مآبی کے تذکرے ان لوگوں کے سامنے زیادہ دلیری اور جرأت کے ساتھ بیان کرتی ہے جو اس کی عصمت کا بارہا سودا کر چکے ہیں۔

آشا یا نراشا؟

(۸۵)

وطن مقدس، ملت محکوم۔ غلام آبادِ ہند، آشا اور نراشا، امید، مایوسی کے چوراہے پر ہے۔

مادرِ وطن، سونے کی کان۔ دوسروں کا پیٹ پالنے والا، آج دانہ، دانہ کو ترس رہا ہے۔ کہ غلامی کی نحوست اسی کا نام ہے۔

وطن عزیز کے فرزند۔ تلوار کے دھنی۔ بھارت کے لال جس وقت دشمن پر یلغار کرتے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت اُن کے گھوڑوں کو نہیں روک سکتی۔ خواہ اُن کو خون کے دریا میں غوطے ہی نہ کھانے پڑیں۔ لیکن بھارت سپوت رن بھومی میں اپنی شجاعت کے جھنڈے گاڑ دیتے ہیں۔ لیکن جب دشمن کو شکست دے کر دوسروں کے گلے سے غلامی کا طوق لعنت اتار کر اپنے دیس میں واپس آتا ہے تو مادرِ وطن کے پیروں میں غلامی کی بوجھل زنجیریں دیکھ کر آشا اور نراشا کے بھنور میں غوطے کھانے لگتا ہے۔

بزرگانِ مذاہب

گوتمؑ

(۴۶)

ساکیہ منی خاندان کے چشم و چراغ۔ پاٹلی پتر کے راج کمار۔ راج پاٹ۔ تخت و تاج کو تلاشِ حق میں ٹھکرانے والے تیاگ مورتی۔ عرب دیس میں بدھ کے متیا (پیغمبر اسلام) کے ظہور کی پیشین گوئی کرنے والے سچائی کے اوتار۔ بھرے پُرے گھر۔ محبت کرنے والی بیوی۔ محبت چاہنے والے بچے شاہانہ عیش و آرام کو چھوڑ کر رُوح کی پکار، ضمیر کی آواز پر ویرانوں میں پھرنا ہی ثابت کرتا ہے۔ کہ تم مامور من اللہ تھے۔

تلاشِ حق میں، جنگلوں میں بھٹکنے والے الیشور ردبی۔ تم نے دنیا کو ٹھکرایا۔ لیکن دنیا والے تمہاری تلاش میں سرگرداں تھے۔ تم کو گیا میں درخت کے سایہ میں حق کا نروان، سچائی کا عرفان حاصل ہوا۔ یہ وہی نور تھا جس کا ظہور کوہِ طور پر، یروشلم کی وادیوں میں، فاران کی چوٹی پر ہوا۔ اور اسی کی تلاش میں تم نے وہ ریاضتیں کیں کہ دنیا والے اُس کے تخیل سے عاری ہیں

تم مکر و فریب معصیت و جہالت کی دنیا کے لئے نئے بدھ نہ تھے۔ تم سے پہلے بھی اس دنیا میں بہت سے بدھ اپنے وقت پر آئے اور اپنا کام کر کے چلے گئے۔ تمہارے بعد بھی بہت سے بدھ آئے اور اپنے مشن کی تکمیل کی لیکن کتنے دُکھ کی بات ہے کہ تمہاری تعلیم کے خلاف، تمہارے نام لیوا (چین و

جاپان) ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ چین کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ کمزور ہے۔ اس کے پاس وہ جہنمی آلات نہیں، جن سے آزاد قوموں کو غلام بنایا جاتا ہے۔ تم مامور من اللہ تھے۔ تم آیات من آیت اللہ تھے۔ تم سچائی و محبت، رواداری۔ رحم دلی کے اوتار تھے۔ آؤ، اور دیکھو کہ جس ملک نے سب سے پہلے تمہارے محبت بھرے پیغام کو قبول کیا تھا۔ وہی ملک اب خاک و خون میں غلطاں ہے۔ جس ملک میں بے حقیقت کیڑوں کا مارنا جرم تھا، اسی میں خون کے دریا بہہ رہے ہیں۔ اس کے بچے، جوان۔ بوڑھے، عورتیں درندہ صفت جاپانیوں کی سفّاکی و بربریت کا نشانہ بن رہے ہیں۔

آہ! تم نے اپنی ماترِبھومی کو چھوڑ کر جس سرزمین کو اپنایا تھا۔ اُسی پر آج فاسطائیوں کا قبضہ ہے۔ اس ملک کو پھر ایک بدھ کا انتظار ہے۔ تاکہ امن شانتی، پریم۔ رحم دلی کا دور ہو، اور بے رحمی۔ سفّاکی۔ بربریت کا خاتمہ ہو۔

(حریت یکم اکتوبر ۱۹۳۷ء)

مسیحؑ

(۷۴)

آیت من آیات اللہ، نورٌ من نور اللہ۔ مسیحؑ ابن مریمؑ۔ خداوند قدوس کے بھولے پیغامبر۔ شرارت پیشہ بنی اسرائیل کی بھیڑوں کے مقدس گلّہ بان۔ اپنے حواریوں سے دھوکہ کھانے والے بنی اسرائیل کے آخری نبی۔ تمہاری ولادت خداوندِ سینا کا راز۔ تمہاری نمود خداوند خدا کی نیرنگی۔ تمہاری بعثت خداوند سعیر کی نشانیوں میں سے ایک نشانی۔

کوہِ طور پر جس جلوہ کی تاب موسیٰؑ نہ لاسکے اس کا مجسّم ظہور۔ بن باپ کی پیدائش پر دنیا کو محوِ حیرت واستعجاب بنانے والے معصوم نبیؑ۔ مقدّس اور کنواری ماں کی تقدیس پر شہادت دینے والے رسولؑ۔ تم کہ جس نے میرے آقا و مولیٰ (سرورِ کونینؐ) کی بعثت کی شہادت دی۔ تم کہ جس نے اندھوں اور کوڑھیوں کو تندرست کیا۔ تم کہ جس نے اپنے پیروؤں کو پہاڑ پر کھڑے ہوکر حکم دیا کہ

"صداقت، راستبازی، خوش اخلاقی، فروتنی، انکساری اختیار کرو۔ دل کو ناپاک خیالات سے بچاؤ۔ امن واتحاد قائم کرو۔ دشمنوں میں صلح کراؤ۔ بنی نوع انسان سے لڑائی جھگڑا دنگہ فساد۔ حتیٰ کہ دشمن سے بھی دشمنی نہ کرو۔ غیر عورت کی طرف

زنا کی نظر سے بھی نہ دیکھو کہ یہ آنکھوں کا زنا ہے۔ اگر تمہارا ہاتھ برائی کی ترغیب دے تو اُس کو جسم سے جدا کرو۔ دشمنوں کو بھی پیار کرو۔ جو تمہارے ساتھ بدی کرے تم اس کے ساتھ نیکی کرو۔ جھوٹی قسمیں نہ کھاؤ۔ سوائے زناکاری کے اپنی بیویوں کو طلاق نہ دو۔ دنیا کو دکھانے کے لئے عبادت نہ کرو۔ لوگوں کے قصور معاف کرو۔ تاکہ تمہارے قصور معاف کئے جائیں۔ آسمانی باپ پر بھروسہ کرو۔ خدا کے ہو جاؤ۔ دُنیا تمہارے قدموں میں آجائے گی۔ تہمت تراشی نہ کرو۔ عیب جوئی سے پرہیز کرو۔ وعظ کہنے سے پہلے وہ تمام عیوب ترک کر دو جن کی نصیحت کرنا چاہتے ہو۔ اعتراض کرنے سے پہلے اپنے دل کو ٹٹولو۔ دوسروں کی آنکھ کا تنکا نکالنے سے پہلے اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھو۔ اپنے موتی سؤرں کے آگے نہ ڈالو"

اس بلند و برتر اخلاقی تعلیم کے معلّم، آسمان پر سے دیکھ، کہ تیرے نام، تیرے کردار۔ تیری تعلیم کو بدنام کرنے والے تیرے پیرو آج کیا کر رہے ہیں۔ آسمان و زمین پر، پانی اور ہواؤں میں جو شیطانی اور ہلاکت آفریں آلات کے ذریعہ خداوند خدا کے بندوں کو خاک و خون میں تڑپا رہے ہیں، وہ تیری پاک اور برگزیدہ تعلیم کے خلاف اور تیری رُوح کو اذیت دینے والے ہیں۔ آ! اور دیکھ! کہ یہ دنیا ظلم و ستم سے بھر گئی ہے! اور اسکو تیری آمد کا بڑی بے چینی سے انتظار ہے۔ تاکہ دنیا کو پھر امن اخُوّت و پریم کا پیغام دے

کرشن عـ (۸۴)

بندی خانے میں جنم لینے والے لیشودھا کے لال۔ تم کہ مامور من اللہ تھے۔ تم کہ جس نے دنیا کے آخری نجات دہندہ کے عرب دیش میں ظہور کی پیشین گوئی کی۔ اور اُن کی دید کی تمنّا کا اظہار کیا۔ تم کہ قرآن حکیم کے حکم کے مطابق ہندوستان کے پیغمبر و ہادی اکبر تھے۔ تم کہ دنیا کو ظلم و جبر سفاکی و بربریت، وحشت و درندگی سے نجات دلا کر۔ محبّت و پریم۔ رواداری انصاف پسندی، خدا پرستی و رحم دلی کا پیغام لے کر آئے تھے۔ آؤ اور دیکھو کہ

دیا دھرم کا اصول

پر، زبان سے عمل کرنے والے کتنے اپنا چار ہی۔ اور ظلم کے حمایتی بن کر تمہارے نام کو بدنام کر رہے ہیں۔

تم نے انصاف اور حق پرستی، حق پسندی کے لئے اپنے ماموں کنس کا تخت ظلم رانی اُلٹا۔ حق کی حمایت کے لئے مہابھارت میں، ارجن کی رہنمائی کی۔ اور اس کورن بھومی میں ایک زندہ جاوید اُپدیش دیا۔ لیکن کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ تمہارے نام پر قشقہ لگا کر، تمہارے نام کے جھوٹے پجاری، دیا دھرم کے اصول کو بھول کر آزادی و حق پسندی کے پیغام کو فراموش کر کے لوبھ اور مایا کے جال میں پھنس کر۔ بھارت ماتا کی آزادی سے منہ موڑ کر بھارت کی غلامی کی زنجیریں بوجھل کر رہے ہیں۔

ہندوستان کے قابلِ فخر فلسفی، موت اور زندگی کا نغمۂ جاوید سنانے والے ارجن کے رتھ بان، اپنے چکر کو گردش دے۔ کہ اب صبر کا یارا نہیں۔

گؤوں کے پالن کا اُپدیش دینے والے فلاسفر اعظم جس ملک میں دودھ اور مکھن کی نہریں بہتی تھیں وہاں دودھ ناپید ہے۔ حتیٰ کہ ماؤں کی چھاتیوں کا دودھ بھی خشک ہو گیا ہے جس سے بچے اپنی ماؤں کی گود میں بھوک سے بلک رہے ہیں۔ کیا تمہارا فرض نہیں ہے کہ تم اپنے سیوکوں کو پھر وہی اپدیش دو۔ جس سے اس ملک میں دودھ کی نہریں پھر بہنے لگیں۔

حُسنِ مطلق کے جمال روپی۔ دیش سدھارک کا رُوپ دھارن کرنے والے جگت جوتی، کرشن کنہیا۔ رادھے شیام دیش سنکٹ میں ہے، بھارت ماتا کی کمر غلامی کے بوجھ سے دوہری ہو گئی ہے۔ بھارت سپوت اغیار کے اشارے سے کپوت بن گئے ہیں۔ اپنی بنسری کا مدھر نغمہ سناؤ۔ دیش آزاد ہو۔ ہندو مسلم اتحاد ہو۔ بھائی، بھائی کے دُکھ کا شریک ہو۔ ظلم کا ناش ہو۔ اور سب ہی نرناری زور سے نعرہ لگائیں۔

بھارت ماتا کی جے!

(حریت ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۴۱ء)

رامؑ

(۹۴)

رام نام ست ہے۔ رام کام ست ہے۔ رام کی لیلا۔ رام کا جیون۔ رام کا اپدیش۔ رام کا سندیش۔ رام کا گیان۔ رام کا دھیان۔ سب ست اور رام ہے۔

رام کی اطاعت والدین۔ رام کا ست بچن۔ رام کا پتا کی آگیا کا پالن۔ رام کا تخت و تاج چھوڑ کر بن باس کی کڑی منزل میں ثابت قدم رہنا اس دلیش کا سر بلند رکھنے کے لئے کافی ہے۔

ہمالہ سے زیادہ سر بلند رام، عزم و استقلال کے کوہ وقار رام صاحب شمشیر و تدبیر کے دہنی رام۔ جگت سدھار رام۔ جگ جوتی۔ جمال روپی رام۔ رام کے روپ میں رام۔ پتی ورتا ستی سیتا کے پتی رام۔ ویر لچھمن کے بیر ارام تم کہ مامور من اللہ تھے۔ تم کہ راجا ہو کر پرجا منتر تھے۔ تم کہ نا انصافی کے اندھیارے میں انصاف کا چمتکار دکھانے آئے تھے۔ جس نے راون جیسے با اقتدار، سفاک، ظالم۔ جابر۔ اینا چاری۔ صاحب عظمت و جلال کا تخت رعونت اُلٹا۔ تم کہ جس نے اپنی روحانی قوت کا مظاہرہ لنکا کو فتح کر کے کیا۔ اس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ رام کا جیون چرترام ہے۔ رام کی روحانی شکتی غیر فانی ہے۔ رام کے بلند کیرکٹر سے

انسانیت کا مرتبہ اونچا ہوتا ہے۔ رام تھے کہ کشمکش راون کے اتیاچار کے خلاف اس وقت جہاد کیا جب کہ دنیا والے بے سروسامانی کے عالم میں رام کے حملہ لنکا کی کامیابی سے مایوس تھے۔ رام کی شکتی۔ رام کی ہمت رام کا استقلال۔ تاریخ کے غیرفانی شاہکار ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر سال ہندوستان کے چپّہ چپّہ پر کروروں ہندوستانی ہندوستان کے اس صاحبِ عظمت و تقدیس پیغامبر کے قابلِ تقلید جیون چرتر کو رام لیلا کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اور ان کے شاندار کارناموں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

کاش دیوالی کی رات ہندوستان کے ظلمتکدہ میں بھی اُجالا ہو جائے اور بھارت ورش میں رام راج کا سا انصاف ہو۔

(حریت ۲۹ ستمبر ۱۹۶۱ء)

سچائی، اتحاد اور امن کا پیغامبر

(۵۰)

ہندوستان میں مغل ایمپائر کا جنم داتا "بابر اعظم" حکمران ہے ہندوستان ان تمام برائیوں میں مبتلا ہے۔ جن کا تصوّر ایک انسان کے دل و دماغ میں آسکتا ہے۔ مادرِ وطن کے بلند پایہ مصلح ہندوستان کی اصلاح اور ترقی سے مایوس ہو چکے ہیں۔ تلونڈی (پنجاب) حال ننکانہ صاحب میں سچائی۔ اتحاد۔ امن کا پیغامبر۔ پورنماشی کے دن پیدا ہوتا ہے۔ گویا آسمان کا چاند دوسرے روز سے غروب ہونا شروع ہوتا ہے اور روحانیت کا ہلال طلوع ہونے اور ترقی کرنے لگتا ہے۔

ہندوستان میں ہندو مسلمان آپس میں دست و گریباں ہیں۔ ایک خدا کو چھوڑ کر ہزاروں دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی ہے۔ انسانیت کے اعلیٰ اصولوں کو پیروں کے نیچے روندا جاتا ہے۔ نا اتفاقی کی دلدل میں سب پھنس جاتے ہیں۔ سچائی۔ اتحاد کے پیغامبر حضرت بابا گورونانک جی کا ظہور ہوتا ہے۔ جن کا پاک اور مقدّس مشن سچائی، اتحاد اور امن ہے۔

حضرت گورو صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی اعلیٰ تعلیم نے بہت ہی تھوڑے عرصہ میں نفاق آبادِ ہند کی کایا پلٹ دی۔ سچائی اور اتحاد کا پیغامبر گھر گھر پہنچا۔ معرفت کے متوالے روحانیت کے اوتار کی خمخانۂ توحید کے

مستانے نانکی آستانۂ معرفت پر دوڑے۔ ساقیِ حقیقت آشنا کے میخانہ سے ایک بھی خالی نہ لوٹا۔ اس کے مستانوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ جن کی دوستی اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ہندو اُن کو ہندو سمجھتے تھے اور مسلمان اُن کو مسلمان سمجھتے۔ لیکن وہ کیا تھے اس کو دیکھنے کے لئے حقیقت آشنا آنکھیں۔ معرفت آگاہ دل کی ضرورت تھی۔ اور وہ دل فقرائے اسلام حضرت بابا فریدؒ۔ حضرت میاں میرؒ وغیرہ کا تھا کہ انھوں نے گورو صاحب کو دیکھا بھی اور سمجھا بھی۔

ساقیِ معرفت نے کہا

(۱) اس گورو (خدا) پر جس نے انسان کو فرشتہ بنایا اور اس میں کچھ دیر نہ لگی۔

(۲) کسی کے خلاف بُرے الفاظ استعمال نہ کر۔ کہ سب میں تیرا ربّ ہے
کسی کا دل نہ توڑ۔ کہ یہ انمول موتی پھر کسی قیمت پر بھی ہاتھ نہ آئیگا۔

(۳) اگر تجھ کو خدا کی تلاش ہے۔ اور اس محبوب ازلی کے وصال کی تمنّا ہے تو بُری باتوں سے اُن کے دل نہ توڑ۔

(۴) نہ میں کسی کا دشمن ہوں نہ کوئی میرا دشمن ہے۔ میں نے سب کو اپنا ساجن بنالیا ہے۔

(۵) ایک ہی خدا سب میں جلوہ گر ہے۔ اور سب ہی اس کے بندے ہیں

(۶) تمام جانداروں کا ایک ہی پیدا کرنے والا ہے۔ جن کو وہ کبھی نہیں بھولتا۔

(۷) ایک خدا کی عبادت کرنے سے انسان دوسروں کے خوف سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اس اعلیٰ توحید، اس بلند پایہ سچائی۔ حق پسندی۔ اتحاد، دوستی امن پروری کا مظاہرہ کرنے کے لئے حضرت گورو صاحبؒ کا ظہور ہوا اور وہ اپنے مقدس مشن میں کامیاب ہوئے۔ حضرت بابا صاحبؒ کا یہ پیغام اسلام سے جتنا قریب ہے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ توحید اور خالص توحید کا جو معیار حضرت بابا صاحبؒ نے پیش کیا ہے اُس کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو آج سکھوں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہ ہونی چاہئے لیکن افسوس ہے کہ سکھ اور مسلمان دونوں اپنے مذہب کی تعلیم کے خلاف چل رہے ہیں۔ اور اس سے زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ اپنی غلط روی کا نام اُنھوں نے مذہب کی خدمت رکھ لیا ہے۔

حضرت بابا نانکؒ دیو صاحب کی تعلیم میں سچائی کا بڑا درجہ ہے اور یہی سچائی اسلام کا زیور ہے۔ لیکن کتنے تعجب کی بات ہے کہ سکھ اور مسلمان دونوں ہی سچائی سے بہت دُور چلے گئے ہیں۔ اور سامراج کی عیاریوں نے سکھوں اور مسلمانوں کے متعلق ایسی دل آزار اور اشتعال انگیز غلط بیانیاں کی ہیں۔ کہ اُن کو اگر حق پسندی کی کسوٹی پر رکھا جائے تو ننانوے فیصدی غلط فہمیاں سکھوں اور مسلمانوں کی دُور ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس تلخ حقیقت کو بے نقاب کون کرے۔ اسی طرح حضرت بابا صاحب کے پیغام میں امن کا بڑا درجہ ہے۔ اور اسلام کا دوسرا نام امن ہے۔ لیکن سکھوں

اور مسلمانوں میں سے کتنے پڑھے لکھے رہنما ایسے ہیں جو اس حقیقت سے واقف اور اس پر عامل ہیں۔

اگر آج حضرت باباصاحبؒ کے محبت بھرے پیغام پر پنجاب میں عمل ہو تو پنجاب جو ہندوستان کی آزادی کے لئے السٹر بنا ہوا ہے اور عیار سامراج اس سے اپنی گرتی ہوئی چھت میں اڑواڑ لگائے ہوئے ہندوستان کی غلامی کی میعاد میں اضافہ کا باعث نہ ہو۔ بہر حال میں حضرت باباصاحب کے جنم دن کے احترام میں عقیدت، محبت، پریم، شردھا کے چند پھول پیش کرتا ہوں۔ اور مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ حق و صداقت، سچائی اور اتحاد کے متعلق گورو صاحب کے اقوال پڑھیں۔ اور سکھوں سے یہ گذارش ہے کہ وہ حضرت باباصاحبؒ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کو اجنبی نہ سمجھیں۔ کہ اسی میں ہندوستان کی آزادی کا راز ہے۔

(حریت ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۱ء)

کلغی والے پھر آ

(۵۱)

کلغی والے مہاراج! امر شہید گرو سیف دھنی۔ تیاگ مورتی۔ پریم مورت، مہا بلوان۔ پھر اس دھرتی پہ آ۔ کہ حق و صداقت کا پرچم سرنگوں ہوگیا ہے۔ جس اَنیائے کو مٹانے کے لئے تونے اپنے نونہالوں کا بلیدان دیا۔ اپنی شریک زندگی کو تیاگا۔ انتہا یہ ہے کہ اپنی جان بھی قربانی کے لئے پیش کی۔ اب اس سے زیادہ ظلم، اس سے زیادہ جبر، اس سے زیادہ حق کی مظلومیت کا دور ہے۔ لہٰذا

کلغی والے گرو! پھر آ!

اس ظلم و ستم، ناانصافی سے بچا جو ناقابلِ برداشت ہے۔ مغربی سائنس داں، زخمی کو موت کے آہنی پنجہ سے بچانے کے لئے انسان کے تازہ اور تندرست خون کا انجکشن دے کر مُردہ جسم کو زندہ کرتے ہیں۔ تونے اے شیر نیستان! یہ علاج آج سے صدیوں پہلے دریافت کر کے اپنے قابل فخر پتا اور اپنے پھلبوا سے لال، اپنے جگر گوشوں۔ اپنے دل کے ٹکروں کا خون پنتھ کے تنِ مردہ میں دیا۔ اور جب اس سے بھی مُردہ قوم کی سرد لاش میں حرکت نہ ہوئی تو اپنے گرم اور تازہ خون کا انجکشن دے کر قوم کو زندہ کیا۔ لیکن گرو مہاراج! پنتھ پہلے سے زیادہ مُردہ ہے۔

کلغی والے سو رہا پھر آ!

اور دیکھ کہ حق مظلوم ہے۔ ناانصافی کا دور ہے۔ ملک غلام ہے۔ قوم بحیں ہے۔ پنتھ کو غداروں نے مرض النوم میں مبتلا کر رکھا ہے۔ تیری پیدا کردہ قربانی کی اسپرٹ فنا ہو گئی ہے۔ ظلم کی حمایت کو سعادت سمجھا جا رہا ہے آزادئ وطن کی بجائے وزارت، ملازمت اب سکھوں کا نصب العین ہے۔ مظلوموں کا حمایتی اب ظالموں کا شریک کار ہے۔ اس لئے۔

کلغی والے مہاراج آ!

اور پھر آ! باندھ کمر۔ اُٹھا علم حق پرستی۔ لگا نعرۂ آزادی۔ اور ایسا نعرہ بلند کر کہ بے کسی و محکومی کی بنیادیں ہل جائیں۔ دشت و جبل گونج اُٹھیں بزدلوں کے کلیجے پھٹ جائیں۔ خالصہ جی کو اپنا کر تو یہ یاد آئے۔ تیرے اُپدیش کا پالن کرے۔ دیش آزاد ہو کہ یہی تیری زندگی کا مقصدِ وحید تھا۔ محکومی زنجیریں ٹوٹیں۔ غلامی کا طوقِ لعنت گرے۔ ہندوستان کا تفرقہ دُور ہو۔ اتحاد و آزادی کا سورج طلوع ہو۔

ست سری اکال

(حریت ۸۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

وہ آنکھیں!

(۵۲)

وہ آنکھیں جو اس ظلمت لدہ عالم میں پورن ماشی کی رات کو تلونڈی کے مقدّس مقام پر عالم غربت میں کھلیں۔ جن کی روشنی کو دیکھتے ہی آسمانی چاند مسکرا دیا۔ اور زمین کے اس کبھی نہ غروب ہونے والے چاند کی روشنی نے اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ کہ اُن کی منارہ کی روشنی تیز سے تیز تر ہو کر تاریکی پر چھا گئی۔

وہ آنکھیں جو اس عالم فانی، کائنات لاثانی کا مشاہدہ کرنے کے لئے کھلی تھیں، جن میں اتحاد۔ پریم۔ شانتی کا پیغام تھا۔

وہ آنکھیں سندر ساجن ——— سندر روپ۔ پربھو۔ پرم آتما کی آنکھوں کی مبینک تھی، جو وحدہٗ لاشریک خدا کو ایک نرنکار۔ واہ گرو کو دیر و حرم میں یکساں دیکھ رہی تھیں۔

وہ آنکھیں جو اس براعظم کی دو بڑی قوموں کو ایک دیکھتی تھیں۔ ایک سمجھتی تھیں کہ وہ ایک ہی خدا نے پیدا کی تھیں۔ جنھوں نے فطرتِ الٰہی کے مشاہدہ سے کثرت میں وحدت کے راز کو سمجھ لیا تھا۔

وہ آنکھیں جن کے دید کی تمنا، اس کائنات کے ہر ذرہ کو تھی کہ اُن آنکھوں میں شراب معرفت چھلکتی تھی۔ جنھوں نے فرزانوں کو دیوانہ۔ بیگانوں کو اپنا اور دیوانوں کو فرزانہ بنایا۔

وہ آنکھیں جو زمین پر کھلتی تھیں لیکن آسمان کا کوئی بھید ان سے پوشیدہ نہ تھا۔ جن میں وحدت و یکتائی۔ محبت و اخلاص کا پیغام تھا۔

وہ آنکھیں جو حق آگاہ۔ حق شناس۔ حق پسند، حق بیں۔ معرفت نگاہ۔ بھگت نواز۔ ظلمت شکن، بصیرت افروز، سرور آگیں تھیں۔ مئے وحدت سے سرشار و مست تھیں۔ جو غلامی کی بے کسی۔ محکومیت کی لعنتی زندگی پر موت کو ترجیح دیتی تھیں۔

وہ آنکھیں پریم مورت، مہابلوان شکتی سروپ۔ جمال روپی حسین کامل مظہر الہی۔ اتحاد و اتفاق، معرفت و پریم کے اوتار۔

حضرت گرو نانک علیہ الرحمتہ

کی تھیں۔ جو نرگس سے زیادہ مست تھیں۔ جن میں میخانۂ معرفت کے ساقی نے شراب معرفت کے جام چڑھائے۔ انہی نشیلی انکھڑیوں، مست اداؤں پر محبت و عقیدت، پریم و شردھا کے یہ کاغذی پھول نچھاور کرتا ہوں۔

حضرت بابا صاحب کے پوتر جنم کو منانے والو! ان مبارک آنکھوں کی قسم کھا کر اس مقدس مقام سے سب ہی نر ناری اُٹھیں کہ گرو مہاراج کے مقدس مشن (ہندو مسلم اتحاد) کی تکمیل کے لئے سر اور دھڑ کی بازی لگا دیں گے کہ اسی کے لئے گرو مہاراج کا ظہور ہوا۔

بولے سو نہال!
ست سری اکال

حریت ۵۔ نومبر ۱۹۲۲ء

سُنا دو!

(۵۳)

وہی بنسی سنا دو کرشن پیارے، جس میں مدینہ والے پیا کی آمد کا نغمۂ حیات افروز تھا۔ ہاں ہاں وہی رعد آسا بنسی سنا دو جس کو سُن کر ظالم و جابر کنس کا ماتھا ٹھنکا۔ اور جس نے تمہارے ورود (ولادت) کو روکنے کے لئے ہزاروں معصوموں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ مگر تم کہ سچائی کے اوتار تھے۔ تم کہ مامور من اللہ تھے۔ تم کہ اس دنیا میں حاکمانہ گھمنڈ۔ غرور اور اونچ نیچ کے امتیاز کو نیست و نابود کرنے کے لئے آئے تھے۔ تم کہ مظلوموں کے ساتھ انصاف کرانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے کیونکر تیغِ جفا کا شکار ہو سکتے تھے؟

وہی رس بھری بنسی، پریم بھری بنسی، جس نے گوکل کے حق پسندوں کو تمہارے گرد جمع کر دیا تھا۔ سنا دو کرشن مراری جس کو سنکر انسان اپنے گھروں سے۔ جانور اپنے آشیانوں سے نکل کر تمہاری طرف والہانہ اور مضطربانہ دوڑتے تھے۔

تم کو لیشو دھا میّا کی قسم! وہی مدھ بھری بنسی سناؤ جس کو سنکر گوکل نواسی تم پر پروانہ وار فدا ہوتے تھے۔

زُلفوں والے کرشن، سندر مکٹ والے کرشن۔ گوکل والے کرشن،

متھرا باسی کرشن ۔ مہا بلوان کرشن ۔ رس بھری آنکھوں والے کرشن جگت سدھار کرشن! سنا دو، تم کو رادھا پیاری کی قسم، وہی کلیجہ کے پار ہونے والی بنسی کی آواز سناؤ ۔ جس نے کنس کا تخت ظلم رانی الٹ دیا تھا۔

بنسی والے سجنا، مرلی والے پریتم ۔ کوروں اور پانڈوں کے رن میں ارجن جیسے ہوشمند کو دیوانہ بنانے والے پریم مورت ۔ پریم دھنی ۔ وہی بنسی سناؤ۔ جس کو سن کر رن بھومی سے بھاگنے کا ارادہ کرنے والا ارجن ویر ارجن بن کر تمہاری زیر لب مسکراہٹ اور ننگہ نیم باز کو دیکھکر اپنے عزیز و اور بزرگوں پر تیر چلانے سے نہ چوکا۔

گئوؤں کے پالن ہار کرشن! ان نرگسی آنکھوں کی قسم جنھوں نے پریم مورت رادھا کو بیچین کر رکھا تھا، وہی بنسی سنا دو جس کو سن کر فلسفی اپنا فلسفہ بھول جاتے تھے، اور جس کے آگے تمام نغمے بیکار تھے ۔ اور جس میں بجلی سے زیادہ کھینچنے کی کشش تھی ۔ ایک بار پھر گوکل کے ویرانوں میں متھرا کے استھانوں میں پھر وہی سُریلی اور رسیلی بنسی سناؤ۔ اور دیکھو کہ جس قوم کے آدھار کے لئے تم مبعوث ہوئے تھے اُس نے تمہاری پوتر تعلیم کو فراموش کر کے انیائے پر کمر باندھ لی ہے۔

فلسفۂ حیات و ممات کو میدان جنگ میں حل کرنیوالے فلسفی! وہی روح پرور بنسی سناؤ جس کو سنکر جمنا کی لہریں ساکن ہو جاتی تھیں ۔ اسی روح پرور بنسی میں وہ صور ہو کہ بد نصیب دیش ۔ غلام ہندوستان، محکوم ہندوستان ۔ پرہیزگاروں کا وطن ہندوستان آزاد ہو جائے۔ پھر کیا تم اس انیائے کو دیکھکر مدھ بھری بنسی اور وہ بنسی نہ سناؤ گے جس کے سننے سے دیش کا کلیان ہو؟ اور جس کے لئے تمہارے بھگت بیچین ہیں۔

طنزیات

نانی امّاں

(۵۵)

آج مجھے نانی اماں کے حالات سنانے ہیں۔ نانیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک محلّہ کی نانی اماں، اور ایک میری نانی اماں۔ کہئے کونسی نانی امّاں کے حالات سناؤں۔

آج تو محلہ کی نانی اماں کے حالات سن لیجیے۔ اپنی نانی اماں کے حالات پھر سہی۔ لیجئے وہ سامنے سے چلی آرہی ہیں۔ ذرا ان کا حلیہ ملاحظہ ہو عمر ایک سو بیس سال کی۔ سانولا رنگ۔ چھوٹی چھوٹی گول مگر چیپڑ زدہ آنکھیں، جو اندر دھنس کر تقریباً غائب ہوگئی ہیں۔ پپوٹے لٹک کر آنکھوں کے لئے چلمن بن گئے ہیں۔ منھ میں ایک دانت بھی نہیں۔ اس لئے منہ ہمیشہ کھلا ہی رہتا ہے۔ زبان دانتوں کی بتیسی نہ ہونے سے اکثر باہر نکلی رہتی ہے۔ اس کی وجہ سے خاصی کالی کلکتہ والی معلوم ہوتی ہیں چہرہ پر جُھرّیاں اس غضب کی پڑی ہیں کہ نچڑی ہوئی دھوتی معلوم ہوتی ہے ناک لٹکا چڑے والے کی تھیلی معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ اتنی لٹکی ہوئی ہے کہ ہونٹوں کا بوسہ لے رہی ہے۔ کمر جُھک کر دوہری ہوگئی ہے اور جب نانی گھٹنوں پر ہاتھ رکھکر چلتی ہیں تو چلتی پھرتی ٹیبل معلوم ہوتی ہیں۔ ٹھوڑی پر ہلکی ڈاڑھی نمایاں ہے جو پیرنا بالغ ہونے کی علامت ہے۔

نانی اماں جب بیٹھتی ہیں تو گردن کے لئے گھٹنے اسٹینڈ کا کام دیتے ہیں۔ اور جس وقت گھٹنے کانوں سے معانقہ کرتے ہیں اور نانی اماں کی گردن گھٹنوں کے بیچ میں سے نکلتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کھٹنی ہے جو موری میں سے جھانک رہی ہے۔ آواز اگرچہ رسیلی تو نہیں ہے مگر گرج اور کڑاک غضب کی ہے۔

سفید بالوں میں مہندی کا خضاب ہے جس سے نانی خاصی سرخاب کی مادہ معلوم ہوتی ہیں۔ آنکھوں میں دنبالہ دار کاجل لگا ہوا ہے جس نے آنکھوں میں پانی آنے کے بعد نانی اماں کو خاص بیجا بنا دیا ہے۔ کانوں میں پتے اور بالیاں ہیں۔ گلے میں چمپاکلی اور ٹیپ ہے۔ بازوؤں پر جوشن ہیں۔ ہاتھوں میں چوہے دنتیاں اور پہنچیاں ہیں۔ پیروں میں جھانجن ہیں۔ سرخ ململ کی وصلی کی جوتی۔ چوڑی دار سیاہ گورنٹ کا پائجامہ۔ پابل لیٹ کا کامدانی کے کام کا کرتہ۔ سرخ جارجٹ کے دوپٹہ پر زردوزی بوٹیاں۔ کنارے پر ٹھپے کی گوٹ۔ منھ میں پنڈولی سے کٹا ہوا پان جو باچھوں سے بہہ کر ٹھوڑی تک آ گیا ہے۔ کنگھی چوٹی نک سے ٹُسک۔ پٹیاں جمی ہوئیں۔ غرضکہ نانی اماں اس وقت خاصی بیر بہوٹی معلوم ہوتی ہیں۔

محلہ کے بچوں کا ایک غول نانی کے پیچھے شور مچاتا چلا آ رہا ہے۔ ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر کہا، نانی کب مروگی؟ نانی نے مڑ کر دیکھا اور کہا جوانا مرگ۔ مریں میرے بیری۔ مریں میرے دشمن۔ تجھ کو ڈھائی گھڑی کا

ہیضہ ہو۔ زمین پھٹے تو سما جائے۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے جو میں مر دل۔ یہ کہہ کر نانی نے لکڑی اُٹھائی اور بچے بھاگ گئے۔

اتنے کوسنوں کے بعد نانی کا سانس پھول گیا۔ اور انھوں نے کمر سیدھی کرکے چند منٹ میں اپنے حواس درست کئے۔ اور پھر مولوی فخر الدین سابق تحصیلدار کے مکان میں داخل ہوئیں۔ جہاں آج اُن کی پوتی کی چھٹی ہے۔ نانی نے قدم رکھا ہی تھا کہ نانی کا پیر کیلے کے چھلکے پر پڑتے ہی رپٹا۔ نانی نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی۔ مگر دھڑام سے طوطے کے پنجرے پر چاروں خانے چت۔ پنجرے کی تیلیاں ٹوٹیں اور نانی کا ہاتھ پنجرے میں۔ طوطا تھا پہاڑی۔ اس کے حواس اس اچانک زلزلے سے سنبھلے تو اُس نے یہ سمجھا بلّی آئی۔ گھبرا کر پہلے تو زور سے ٹیں کی۔ اور پھر چونچ کھولکر جو بکٹا بھرا ہے تو نانی اماں کے بازو کی بوٹی غائب تھی۔ یہ سارا واقعہ کچھ ایسا اچانک اور تیزی سے پیش آیا کہ کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا۔ مہمان اور میزبان دوڑے۔ نانی کو اس حالت میں دیکھ کر بچے بے ساختہ ہنس پڑے۔ بڑوں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے نانی سے ہمدردی ظاہر کی۔ نانی نے کڑک کر کہا کہ چڑیلو کھڑی ہوئی تماشہ دیکھ رہی ہو۔ مجھے اُٹھاؤ۔ میرے کھوے میں چوٹ آئی ہے۔ بازو خونم خون ہو رہا ہے۔ کلیجہ بلّیوں اُچھل رہا ہے۔ دم گھٹا جا رہا ہے۔ ہاتھ پیروں میں سنسنیاں آ رہی ہیں۔ سب مہمانوں نے نانی کو ڈنڈا ڈولی کرکے اُٹھایا اور زچہ کے پاس ایک پلنگ پر لٹا کر کُولے پر ہلدی چونا گرم کرکے لگایا

اور بازو پر امام ضامن باندھ کر ٹھنڈا دم دیا گیا اور عرق بید مشک اور عرق گلاب میں شربت انار ملا کر نانی کو پلایا تو نانی کی آنکھیں کھل گئیں۔

نانی کے ابھی حواس ٹھکانے نہیں ہوئے تھے کہ ایک بچی نے پاس آکر نہایت ادب سے سلام کیا۔ نانی نے چُندھیا کر دیکھا اور کہا، چاند سے مکھڑے کا صدقہ لیا آئے۔ بوڑھ سہاگن ہو۔ دودھوں نہاؤ۔ پوتوں پھلو۔ نانی کی دعاؤں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک لڑکی نے کان کے پاس منھ لے جا کر کہا۔ نانی اماں دادا عزرائیل نے سلام کہا ہے۔ یہ سنتے ہی نانی نے کہا کہ مردار کلموئی۔ تیرے منھ میں کیڑے پڑیں۔ عزرائیل کا سلام ہو تیرے دہے سہوں پر۔ عزرائیل آئیں تیرے ماں باپ پر لعنت ہو تجھ پر اور تیری سات پشت پر۔ صدقہ میں اتاروں تجھ کو اور تیرے دادا کو۔ وہ تیرے کوئی سگے ہوں گے۔ میں تو اُن کی صورت سے بیزار ہوں۔ لڑکی مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ مگر نانی کا وظیفہ جاری رہا۔ سب مہمان نانی کے پاس دوڑے۔ کسی نے نانی سے ہمدردی ظاہر کی اور کسی نے بچی کی ہمت افزائی کی۔

کھانے کا وقت قریب آگیا تھا۔ بریانی کی دیگ کھلی۔ نانی کی ناک میں خوشبو پہنچی تو ہوشیار ہوئیں۔ اور پلنگ سے نیچے اتر، گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ بچے اور بوڑھے سب ہی ان سے مذاق کرتے تھے۔ اس لئے مختلف طریقے سے ان کو چھیڑا جاتا تھا۔ کسی نے کہا نانی تم پر لوگزہ تعزیہ گر پڑے کسی نے کہا نانی قلاقند کھاؤ گی۔ کسی نے کہا گلاب جامنیں نانی

کو بہت پسند ہیں۔ نانی نے سیکڑوں صلواتیں سنا دیں۔ سب نے قہقہے لگائے۔

عبدالرحیم کوتوال کی بیوی نے نانی کو سُرخ جوڑا پہنے اور سینگا گٹا کرکٹروں میں ملے دیکھا تو بے ساختہ کہا اوہ باسی کڑھی میں اُبال آیا ہے۔ ان کو نانی اماں کیوں کہتے ہو یہ تو نانی دلہن معلوم ہوتی ہیں۔ نانی بھی نیچی نظریں کرکے سکڑیں۔ اور گردن جھکا کر اس طرح بیٹھ گئیں کہ چا ہوں کی دلہن معلوم ہوتی ہیں۔

نانی بھتیں بڑی ندیدی۔ اس لئے دستر خوان بچھنے اور کھانا آنے سے پہلے انھوں نے بہتیرے سوالات پاس کی بیٹھنے والیوں سے کر ڈالے کہا کے قسم کا کھانا ہے۔ بریانی میں پوسیری گھی ہوگا۔ چاول دیسی ہے جب ہی تو اتنی اچھی خوشبو ہے۔ سیلے میں کیا خاک مزہ ہوتا ہے۔ زردہ میں لگر ونڈے بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ بریانی کے ساتھ لوانی بھی ہوگی۔ بغیر لورانی کے بریانی اچھی نہیں۔ باقر خانیاں سیر کی چار ہوتی ہیں۔ مجھ سے ایک سے زیادہ نہیں کھائی جاتی۔ غرضکہ نانی اپنے ندیدے پن کا ثبوت دے رہی تھیں۔ اور بڑی بے صبری سے کھانے کا انتظار کر رہی تھیں۔ کھانے کی خوشبو سے نانی کے منھ میں پانی بھر آیا۔ اور اُن سے ضبط نہ ہو سکا تو پاس والی سے کہہ اُٹھیں کہ کھانا لانے والی بڑی سست ہیں۔ سب نے قہقہہ لگایا۔ اور کھلانے والی بیوی کو توجہ دلائی کہ نانی کے پاس ابھی تک کھانا نہیں آیا۔ نانی اس سے ناراض ہوئیں اور کہنے لگیں کہ میں کوئی ندیدی ہوں۔

پاہیں فاقہ سے ہوں۔ جب سب کے پاس آئے گا تو میرے پاس بھی آجائیگا بے صبری کا ہے کی ہے۔ پاس والی بیوی بولیں کہ میرے خیال میں تو سب ہی ندیدے ہیں۔ کسی کا ندیدہ پن ظاہر ہو جاتا ہے اور کسی کا نہیں کسی کے ندیدے پن کی پردہ پوشی اچھے اچھے کپڑے کرتے ہیں اور کسی کے ندیدہ پن کو زیور ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ غریب کا ندیدہ پن ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور امیر کا اس کی عزت و وقار کے سبب ظاہر نہیں ہوتا۔ بعض کا ندیدہ پن اُن کی بزرگی و عظمت کے سبب محسوس نہیں کیا جاتا۔ اور اگر محسوس بھی ہوتا ہے تو اس کا اظہار نہیں ہوتا۔ اور بعض کے ندیدہ پن کو افلاس اور غریبی کی وجہ سے بھی محسوس کیا جاتا ہے۔ اور اس پر دل کھول کر اظہار خیال بھی کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہیں دونوں ندیدے۔ چنانچہ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ کا قصہ تو سب ہی نے سُنا ہوگا کہ ایران کے ایک رئیس نے بڑی منت سماجت سے حضرت سعدیؒ کی دعوت کی۔ اور انھوں نے بڑے اصرار سے اس کو قبول کر لیا۔ مگر جب دعوت میں تشریف لے گئے تو کسی نے التفات نہ کیا۔ کیونکہ ان کا لباس بہت ہی خراب تھا۔ بیچارے دسترخوان پر خود ہی بیٹھ گئے۔ اور بیٹھتے ہی شیرمال گھسیٹی منتظمین اس ندیدہ پن سے اتنے ناراض ہوئے کہ شیخ کو اُسی وقت با بدست دگرے مہمان خانہ سے نکال باہر کیا۔ مگر شیخ بھی پہنچے ہوئے تھے۔ آسانی سے قابو میں آنے والے نہ تھے۔ فوراً بازار گئے۔ اور مولویوں کا لباس کرایہ پر لے کر پہنا اور جون بدل کر سیدھے اسی دعوت میں

پہنچے جہاں سے نکالے گئے تھے۔ اس مرتبہ شیخ کو مولویانہ لباس میں دیکھ کر دعوت کے منتظمین مرعوب ہوگئے۔ اور شیخ سعدی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور نہایت عزت و احترام سے ان کو صدر جگہ بٹھایا گیا۔ شیخ نے دسترخوان پر بیٹھتے ہی پھر شیرمال پر ہاتھ ڈالا۔ اس مرتبہ کسی نے شیخ کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ بلکہ دوسری قسم کے کھانے شیخ سعدی کی طرف بڑھائے۔ مگر شیخ نے وہ سب کھانے اپنے مقدس چغہ کی آستینوں میں بھرنے شروع کئے۔ لوگوں نے حیرت سے شیخ سعدی کو دیکھا۔ بعض زیرلب مسکرائے بعض نے شیخ کو حواس باختہ سمجھا۔ اور بعض نے حقیقت حال معلوم کرنے کی کوشش کی۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ "بھائیو! میں تو وہی حقیر بندہ فقیر ہوں جس کو آپ نے ابھی چند منٹ پہلے اس دسترخوان سے بصد ذلت و خواری اُٹھا دیا تھا۔ مگر چونکہ میں مولویوں کے چند کپڑے کرائے پر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس لئے آپ لوگوں نے مجھے دسترخوان پر بیٹھنے کی اجازت دی۔ اس لئے میں کھانے کا مستحق نہیں ہوں۔ بلکہ میرے یہ کپڑے کھانا کھانے کے مستحق ہیں۔ جن کی وجہ سے میں دسترخوان پر بیٹھ سکا۔ حالانکہ میرا جسم وہی ہے جو پہلے تھا۔ اس لئے یہ عزت و توقیر ان کپڑوں کی ہے۔

یہ سنکر سب بیویاں ہنسنے لگیں اور نانی سُنے بھی کھسیانی ہنسی ہنسی۔ کھانا آیا۔ نانی نے اللہ اللہ کرکے کھانے پر ہاتھ صاف کیا۔ بریانی کی ایک رکابی، ڈیڑھ شیرمال۔ زردہ کی ایک رکابی۔ فیرنی کا ایک خوانچہ

کھانے کے بعد گردن اُٹھا کر پانی مانگا۔ اور پھر آپ ہی آپ کہنے لگیں نہ جانے کیا ہوا کہ کھانا ہی کھٹک گیا۔ کنیز فاطمہ ایڈیٹر اخبار شوکت اسلام کی بیوی نے کہا کہ ابھی تو آم باقی ہیں تحصیلدار صاحب نے اپنے گاؤں سے اپنے عیش باغ سے منگوائے ہیں۔ نانی نے کہا: خیر بوا تم کہتی ہو تو میں آم بھی چکھ لوں گی۔ ورنہ آج میرا جی اچھا نہیں تھا۔ کھانا ختم ہوتے ہی آم آئے۔ نانی نے طبیعت کی خرابی کے باوجود پانچ آم کھائے حالانکہ ایک ایک آم پاؤ سیر سے کم نہ تھا۔ آم کھانے سے ابھی فارغ ہو کر بیٹھی تھیں کہ ایک بچہ آم چوستا ہوا نانی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ نانی نے کہا۔ بیٹا کیا کھا رہے ہو۔ اُس نے جواب دیا آم۔ نانی پھر پھڑا کر آم ہے؟ میٹھا یا کھٹا۔ میں دسترخوان سے اُٹھ کر چلی آئی تھی۔ دیکھ بیٹا پیارے بچے بانٹ کر کھایا کرتے ہیں۔ تنہا خوری اچھی نہیں۔ لا میرا لال مجھے بھی چکھا دے۔ یہ کہتے ہی نانی نے چیل کی طرح جھپٹا مارا۔ اور آم چھین کر پوپلے ہونٹوں سے دبانا شروع کر دیا۔ لڑکے نے شور مچایا تو نانی کے حواس گم ہوئے اور فرمانے لگیں کہ کیسا شریر لڑکا ہے میرے منہ سے آم چھیننا چاہتا ہے۔ نہیں دیتی تو شور مچاتا ہے۔ مہمانوں نے جو لڑکے کا غل سنا تو سب نانی کے پاس جمع ہو گئے۔ بڑھیا نے سب کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ثابت آم مع چھلکے اور گٹھلی کے نگلنے کی کوشش کی۔ تاکہ چوری اور سینہ زوری کا راز نہ کھُلے۔ مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ سلیے آم نانی کے حلق میں اٹک گیا۔ نانی کا دم گھٹا جا رہا ہے اور آنکھیں

نکلی پڑتی ہیں۔ بہتیرا نگلنے کی کوشش کرتی ہیں مگر آم نیچے اُترنے کا نام نہیں لیتا۔ آخر نانی نے ہلکان ہوکر ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دے۔ اور لگیں موت کی گھڑیاں گننے۔ صاحب خانہ نے فوراً ڈولی منگوائی اور نانی کو شفاخانہ بھیجا۔ جہاں کلوروفارم سُونگھاکر نانی کے گلے کا آپریشن کیا گیا۔ اور وہ آم مع گٹھلی اور چھلکے کے برآمد ہوا۔

آج نانی کو شفاخانہ میں داخل ہوئے پورے دس دن ہوگئے ہیں۔ مریض اور نرسیں، ڈاکٹر اور کمپونڈر سب ہی نانی کو چھیڑتے ہیں۔ اور نانی سب کو صلواتیں سناتی ہیں۔ اور شفاخانہ میں بھی ایسی دلچسپ حرکتیں ہیں کہ پناہ بخدا۔

ایڈیٹر کی زندگی کا ایک دن

(۵۶)

سامنے سے جو صاحب چلے آ رہے ہیں ان کا نام ہے "ایڈیٹر" مجھے ان کی زندگی کے ایک دن کے حالات بیان کرنے ہیں۔ ذرا سب سے پہلے ان کا حلیہ دیکھئے۔ چہرہ کتابی ہے۔ جس پر جوانی میں بڑھاپا برس رہا ہے۔ یہ موٹے تازے تو نہیں ہیں۔ مگر توند ضرور آگے نکلی ہوئی ہے کلے پچکے ہوئے ہیں۔ ماتھا بالوں کی سرحد سے خالی ہے۔ چہرہ زرد ہے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔ عینک سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ ناک ستواں ہے۔ جس پر عینک کی کمانی کا نشان ہے۔ تیوری چڑھی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کسی سوچ میں ہیں یا غصہ میں۔ مگر ان کی تیوری کے بل سے غصّہ کا گمان نہ کیجیے۔ یہ غصہ میں نہیں ہیں۔ بلکہ صورت ہی کچھ ایسی ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صاحب خدائی فوجدار ہیں دُنیا جہان کی اچھائی بُرائی کے چوکیدار ہیں۔ شاید شاعر امیر نے یہ شعر ایڈیٹروں ہی کی زبان سے کہا تھا کہ

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

دنیا کا کوئی غم نہیں جو ایڈیٹر صاحب کے دل کو نہ ستاتا ہو۔ اور

دنیا کی کوئی خوشی ایسی نہیں جس میں حصہ بٹانے کا یہ دعویٰ نہ کرتے ہوں۔ قلم دوات کاغذ سے لڑنا ان کا پیشہ ہے۔ چنانچہ جاگنے سے سونے تک یا تو لکھتے پڑھتے رہتے ہیں یا لکھنے پڑھنے کی باتوں پر سوچ بچار کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے تندرستی خراب ہوگئی ہے۔ معدہ اور جگر کی خرابی کی وجہ سے کبھی کبھی ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ دماغ کی چولیں اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ دماغ تو ان کا خراب نہیں۔ لیکن تندرستی ضرور خراب ہے اور تندرستی کی خرابی کی وجہ سے مزاج بھی خراب رہتا ہے

اب اگر ان کی روزانہ کی زندگی پر نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ صبح سویرے اُٹھتے ہیں۔ مگر مسجد یا مندر میں جانے کے لئے نہیں۔ کیونکہ ان کو ملک میں عبادت کے پرچار ہی سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ خود مندر یا مسجد کا رُخ کریں۔ نہ ان کا صبح سویرے اٹھنا اس لئے ہے کہ روایتی صبح خیز بنیے کی طرح کسی کا لوٹا کٹورا تاکیں۔ بلکہ یہ بچارے اس لئے اندھیرے منھ اُٹھتے ہیں کہ اگر گھر دم دو چار میل کا چکر نہ لگائیں تو دن بھر بھوک نہ لگے۔ کھانا نہ کھایا جائے۔ کمزوری کی وجہ سے کام کرنا دوبھر ہو جائے۔ اس لئے بچارے مجبور ہیں کہ تاروں کی چھاؤں میں آرام کا بستر چھوڑ کر آبادی سے نکل جائیں تاکہ صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی کھائیں اور ہلکی ورزش بھی ہو جائے۔

صبح کی سیر سے واپس آ کر نہانے دھونے کی ضرورتوں سے فارغ ہوں گے اور غسل خانے سے نکلتے تک ناشتہ کی جگہ تازہ اخبار چاٹ

جائیں گے۔ اخبار پڑھتے وقت ایڈیٹر صاحب کی حرکتیں دیکھنے ہی نہیں بلکہ تصویر اُتارنے کے قابل ہوتی ہیں۔ اس وقت اگر ان کو کوئی ڈاکٹر دیکھ لے تو فوراً دماغی بیماریوں کے ہسپتال میں بھیجنے کی سفارش کر دے کیونکہ کبھی تو غصے میں مٹھیاں بند کرتے ہیں اور دانت پیستے ہیں اور کبھی اچانک قہقہے لگانے لگتے ہیں۔ چونکہ خدائی فوجدار اور دنیا جہان کی اچھائیوں اور برائیوں کے چوکیدار ہیں۔ اس لئے دنیا کا غم اُن کا غم اور دنیا کی خوشی اُن کی خوشی ہے۔

مگر لطف کی بات یہ ہے کہ یوں تو ایڈیٹر صاحب تمام دنیا کی خوشیوں اور رنجوں میں شریک ہیں۔ لیکن چراغ تلے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ کیونکہ خود اپنے اور گھر اور کنبہ کی خوشیوں اور رنجوں میں اُن کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو جس طرح دنیا کی خوشیاں اور رنج ان کے لئے خوشی یا رنج کا پیام لاتے ہیں، اسی طرح گھر اور کنبے کی خوشیاں اور غم ان کے لئے خوشی یا غم کا سامان کرتے۔ مگر گھر یا کنبہ میں اگر کوئی تڑپ رہا ہے تو ان کو کوئی واسطہ نہیں اور اگر عزیزوں رشتہ داروں کے ہاں کوئی خوشی ہے تو اس میں ان کا کوئی حصہ نہیں یہ تو جاگنے سے سونے تک اخباروں اور رسالوں کے ساتھ روتے یا ہنستے رہتے ہیں۔

خیر غسل خانے سے باہر آتے ہی اُن کو ناشتہ کی فکر ہے لیکن آپ خیال کرتے ہوں گے کہ اُن کے ناشتے میں دو چار انڈے کچھ

پراٹھے۔ کچھ حلوئی وغیرہ ہوتا ہوگا۔ مگر یہ غریب ان چیزوں کو ندیدں کی طرح دیکھ کر ہی سیر ہو جاتے ہیں۔ ان کی قسمت میں تو صرف ایک پیالی چائے لکھی ہے۔ یا اگر بڑی ہمت کی تو ڈرتے ڈرتے چائے کے ساتھ ایک ہلکا سا توس بھی لے لیا۔ ایڈیٹر صاحب کا کھانے سے یہ ڈر —— اس کی وجہ یہ ہے کہ دن بھر وہ بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔ اسلئے اگر ہلکی غذا نہ کھائیں تو بیمار ہو جانے کا سخت خطرہ رہتا ہے۔

اب ایڈیٹر صاحب گھر سے دفتر پہنچ گئے ہیں۔ اور یہاں آتے ہی یا تو یوں کہئے کہ بھوت بن کر مضمونوں کو چمٹ گئے ہیں یا پھر یہ کہنا پڑے گا کہ مضامین کے بھوت اُن کے سر پر کھیلنے لگے ہیں۔ کبھی کچھ لکھتے ہیں۔ کبھی دوسروں کا لکھا ہوا پڑھتے ہیں۔ کبھی خود اپنے لکھے ہوئے کو کاٹتے ہیں۔ اور کبھی کاٹے ہوئے کو پھر سے لکھتے ہیں۔ ان حرکتوں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ گویا یہ زمین اور آسمان اُن کے قلم کے دور سے قائم ہے۔ یا یہ کہ دنیا کی تمام بُرائیاں اُن کے چند لفظوں سے دُور ہو جائیں گی اور یہ کلجگ، ست جگ میں تبدیل ہو جائے گا لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ یہ کلجگ کو ست جگ میں تبدیل کر دینے کا ارادہ رکھنے والے ایڈیٹر صاحب کبھی کبھی خود بھی ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو کلجگ کی خاص نشانیاں ہیں۔ مثلاً اُن کے سامنے کوئی ایسی خبر ہے جس پر ان کو یقین ہے کہ یہ خبر بالکل بناوٹی اور جھوٹی ہے مگر چونکہ یہ خبر ہے دلچسپ اس لئے ایڈیٹر صاحب اس کو اپنے اخبار میں

ضرور چھاپیں گے۔ اب آپ ہی فیصلہ کر لیجئے کہ ایڈیٹر صاحب کی یہ حرکت کہاں تک معقول ہے؟ لیکن اگر کوئی شخص ایڈیٹر صاحب سے یہ پوچھے کہ جناب جب آپ اس خبر کو بناوٹی اور جھوٹی سمجھتے تھے تو آپ نے اُسے چھاپا ہی کیوں؟ تو وہ اُس کا جواب یہ دیں گے کہ کیا کیا جائے پبلک کا ذوق ہی ایسا خراب ہے کہ اگر ہر طرح کی چیز نہ چھاپیں تو لوگ ہمارا اخبار اور رسالہ نہ خریدیں۔ اور ہماری "تلاش" کی داد نہ دیں۔ یہی سبب ہے کہ جو اخبار یا رسالے ایسے مواد کو اپنے صفحات پر جگہ نہیں دیتے وہ پبلک میں مقبول نہیں ہوتے۔ کاش کہ ایڈیٹر صاحب اس حقیقت پر غور کرتے کہ پبلک کا ذوق کوئی فطری چیز نہیں ہے بلکہ اخباروں اور رسالوں ہی کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ یہ اخبار اور رسالے جس طرح چاہیں پبلک کے ذوق کو نئے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ خیر کہنا یہ تھا کہ اس وقت کے حالات میں ایڈیٹر صاحب کو وہ چیزیں بھی چھاپنی ہوتی ہیں جن کی بابت اُن کو یقین ہوتا ہے کہ یہ بُری چیزیں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ایڈیٹر صاحب ایک لحاظ سے تو بڑے ریفارمر اور واعظ اور پرچارک ہیں لیکن دوسرے لحاظ سے ان کی حالت ان خوانچہ والوں کی سی ہے جو سڑکوں اور گلیوں میں "خستہ کچوری گرم گرم آلو چھولے نرم نرم"۔ "دہی کے بڑے کی چاٹ ہے"۔ جیسی آوازیں لگاتے پھرتے ہیں۔ ان خوانچہ والوں کا سودا منہ میں پانی بھر لانے والی آوازوں سے بکتا ہے۔ لیکن سننے والوں کے منہ میں پانی تو اس لئے بھر آتا ہے کہ

وہ جانتے ہیں کہ گرم گرم خستہ کچوری کیسی مزیدار چیز ہے۔ نرم نرم آلو چھولے کیسے لذت دار ہوتے ہیں۔ دہی بڑوں کی چاٹ میں کیسا مزہ ہوتا ہے بالکل اسی طرح ایڈیٹر صاحبان کو اپنے مال کی بکری بڑھانے کے لئے اول تو چٹ پٹی چیزیں اپنے اخباروں اور رسالوں میں درج کرنی پڑتی ہیں۔ دوسرے وہ ان کی ایسی دلچسپ سرخیاں لکھتے ہیں کہ جس سے زیادہ چٹ پٹا ہوجاتا ہے۔ اور لذت بڑھ جاتی ہے۔ الغرض ایڈیٹر صاحب ابھی اسی کوشش اور کاوش سے اپنے مضامین کی ترتیب میں مصروف تھے کہ اتنے میں ڈاک آگئی۔

لیجئے وہ گھبرا کر ڈاک پڑھنے میں مصروف ہیں۔ ان کے پاس جو خط آتے ہیں اگر ان کے رنگ برنگ کے مضمون آپ کو سنائے جائیں تو ہنستے ہنستے آپ کے پیٹ میں بل پڑجائیں۔ کیونکہ ایڈیٹر کی ڈاک سے بہترین تفریح ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت اس کا موقع نہیں ہے یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ کسی نے تو یہ لکھا ہے کہ تم نے فلاں تاریخ کا اخبار یا فلاں مہینہ کا رسالہ نہیں بھیجا۔ بڑے بے ایمان ہو قیمت پیشگی لے کر ہضم کرگئے مگر اخبار یا رسالہ نہیں بھیجے۔ اب ایڈیٹر صاحب حیران ہیں کہ وقت کی پابندی کا یہ انعام ہے۔ کوئی لکھتا ہے کہ ہمارے لڑکے کی شادی فلاں تاریخ کو ہونے والی ہے آپ اس میں ضرور شریک ہوں۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی مگر ایک مزیدار سہرا ضرور لکھتے لائیے گا۔ کوئی لکھتا ہے کہ فلاں معاملہ میں آپ نے جو نوٹ لکھا ہے وہ غلط ہے۔ اس کی تردید کیجئے۔ ورنہ ہم

آپ کا بائیکاٹ کریں گے۔ کوئی لکھتا ہے کہ مجھے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے اتنے روپے کی ضرورت ہے۔ ایک ہفتہ کے اندر یہ روپیہ بھیج دیجئے۔ ورنہ دوسرے اخباروں میں آپ کی شکایت چھپوا دوں گا۔ اور دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کو قوم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ پھر کسی نے لکھا ہے کہ اگرچہ میں مبتدی ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ آپ میری ہمت بندھائیں گے اور میری غزل یا مضمون کی اصلاح کرکے اس کو چھاپ دیں گے۔ حالانکہ ان کو شعر فہمی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ کچھ خطوط ایسے ہوں گے جن کو ایڈیٹر صاحب ردّی کی ٹوکری کے حوالے کر دیں گے اور کچھ خطوط ایسے ہوں گے جو تعویذ کی طرح چھپا کر اٹاچی کیس میں بند کر دئے جائیں گے۔ کہ کہیں کسی کی نظر نہ پڑ جائے جو اثر جاتا رہے۔

ابھی ایڈیٹر صاحب ڈاک پڑھنے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ملاقاتیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایڈیٹر صاحب آؤ بھگت تو بڑی ہنستی پیشانی سے کرتے ہیں۔ لیکن دل اُن کا یہ سمجھتا رہتا ہے کہ دیکھئے کتنی دیر کان کھائے جاتے ہیں۔ ملاقاتیوں سے ایڈیٹر صاحب کی یہ پریشانی بے وجہ نہیں ہے کیونکہ کوئی یہ کہتا ہے کہ ہمارے محلہ میں فلاں بدمعاش نے سر اٹھایا ہے کوئی کہتا ہے فلاں صاحب سے میرے لڑکے کی ملازمت کے لئے سفارش کر دیجئے کوئی کہتا ہے کہ میں نے پبلک کی فلاں فلاں خدمات کی ہیں۔ مہربانی کرکے میری خدمات کا ذکر اپنے اخبار میں کر دیجئے۔ کوئی کہتا ہے کہ صرف آپکی زیارت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ ماشاء اللہ آپ خوب لکھتے ہیں۔ غرض

یہ ہے کہ ایڈیٹر صاحب کے سینکڑوں ملاقاتیوں میں ڈھنگ کے اور کام کے ایک دو آدمی ہوتے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ملاقاتی ایڈیٹر صاحب کے پاس آتا ہے تو اُن کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ ابتدائی علیک سلیک اور ملاقات کا مقصد اور کام کا حال معلوم کرنے کے بعد اور یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ یہ بھی ہزاروں میں سے ایک ہے۔ ایڈیٹر صاحب دل ہی دل میں کڑھنے لگتے ہیں اور دل میں دعائیں مانگنے لگتے ہیں کہ یہ بلا جلد ٹلے۔ کبھی تو ملاقاتی کی بات کے جواب میں ہاں ہاں ہوں ہوں کرکے اشارہ کرتے ہیں کہ ہمیں تمہاری باتیں پسند نہیں۔ کبھی سر جھکا کر لکھنے یا پڑھنے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ اور کبھی فرصت کے وقت ملاقات کے بہانے سے پیچھا چھڑاتے ہیں۔ لیکن بعض ملاقاتی ایڈیٹر صاحب کے صبر سکون کے لئے طوفان کا فرشتہ ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ اول تو وہ اُٹھنے ہی کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ دوسرے ایڈیٹر صاحب کی میز کو ایک اچھے خاصے بھونچال کی طرح تلپٹ کردیتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ جاگنے کے وقت سے سونے کے وقت تک ایڈیٹر صاحب قلم دوات کاغذ سے اخباروں اور رسالوں سے۔ خبروں اور مضمونوں سے خریداروں اور نامہ نگاروں سے۔ ملاقاتیوں اور آنے جانے والوں سے برابر کشتم کشتا کرتے رہتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک سپاہی کی سی زندگی ہے۔ لیکن سپاہی لڑتا ہے تلوار سے۔ یہ لڑتے ہیں دماغ سے اور قلم سے۔

پیدل

(۵۶)

میں آج پیدل پر بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے آپ کو غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ پیدل کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک شطرنج کا پیدل جو ایسا طاقتور ہوتا ہے کہ بادشاہ اور وزیر اور ہاتھی اور سوار سب ہی سے لڑتا ہے۔ دوسرا پیدل کچہری کا پیادہ ہوتا ہے جس کی تنخواہ تو دس بارہ روپے ہوتی ہے۔ مگر اس کی پوزیشن سگ حضوری کی وجہ سے اتنی اہم ہوتی ہے کہ بڑے بڑے خان بہادر اور رائے بہادر اس کی خوشامد کرتے ہیں۔ کچہری میں اور بنگلہ پر بڑے صاحب کے بعد اسی کی حکومت ہوتی ہے۔ اور اس کے اختیارات تو اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ خود بڑے صاحب کے بھی اتنے نہیں ہوتے۔ تیسرا پیدل وہ ہوتا ہے جو سڑک پر پیدل راستہ چلتا ہے۔ اور میں آج اسی پیدل کے متعلق کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں۔

جس طرح ہر چیز میں خوبیاں ہوتی ہیں اسی طرح کوئی بہتر سے بہتر کام بھی باوجود ٹھیک ہونے کے عیب سے خالی نہیں ہوتا۔ اس لئے پیدل پھرنا اچھا بھی ہے اور برا بھی۔ نفع بخش بھی اور نقصان رساں بھی اور بعض اوقات تو مشکلات اور مصائب کا موجب بھی ہو جاتا ہے۔

اور پیدل چلنا اتنا اہم اور ضروری ہے کہ حکیم ڈاکٹر اور وید پیدل چلنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اور وہ بڑے سے بڑے صاحبِ اقبال انسان کو بھی پیدل چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔

مشرقی اور مغربی اطبا نے فرمایا ہے کہ پیدل چلنا پھرنا انسان کی جسمانی صحت کی بنا اور ضائع شدہ صحت کی بحالی کے لئے نہایت مفید مہذب اور ہلکی قسم کی بہترین ورزش ہے۔ صبح سویرے اُٹھ کر کھلے میدانوں اور سبزہ زاروں میں پھرنا۔ ٹہلنا۔ باغوں میں چہل قدمی کرنا۔ صاف اور ستھری زمین پر دوڑنا اور پاکیزہ مقامات پر دور تک پیادہ پا چلنا ہر انسان کے لئے اگر وہ تندرست رہنا ضروری خیال کرتا ہے تو نہایت ضروری ہے۔

صبح و شام کی ہواخوری سواری پر بھی کی جاسکتی ہے۔ مگر سواری میں اگر گھوڑا ہو تو نہایت مفید ہو سکتی ہے۔ موٹر۔ بگھی۔ تانگہ۔ یکہ وغیرہ میں ہواخوری کے لئے جانا امیری کی نمائش تو ہو سکتی ہے۔ لیکن ہوا خوری نہیں ہو سکتی۔ اور اس قسم کی سواری ہواخوری کی حالت میں بھی مفید نہیں ہو سکتی۔ لیکن پیدل ہواخوری کرنا اور صاف ستھرے مقامات پر چلنا پھرنا یا سبزہ زاروں میں دوڑنا ایک ایسی سہل مہذب۔ مفید نفع بخش ورزش ہے کہ اس سے بہتر تو کیا اس کے برابر بھی دوسری ورزش ممکن نہیں۔

ہر شخص کی حالت مختلف ہوتی ہے۔ کمزور اور ضعیف الجثہ یا مریض

انسان صرف پیدل چل کر ہی ورزش کر سکتا ہے۔ مضبوط اور تندرست انسان کے لئے دو چار میل پیدل چلنا اور جسمانی قوت کے مطابق دوڑنا بے حد ضروری ہے۔ اس سے لمبے لمبے سانس آتے ہیں۔ اور اس طرح تازہ ہوا جسم میں داخل ہونے کے ساتھ پھیپھڑوں کی ورزش ہوتی ہے دل اور جگر اور معدہ۔ بواسیر اور تپ دق کے بیماروں کے لئے پیدل پھرنا اکسیر ہے۔ جسم کے جن اعضاء کا تعلق سانس لینے سے ہے۔ ان کی حرکت پیدل چلنے اور دوڑنے سے بڑھ جاتی ہے۔ اور جسم اپنے اندر سے خراب مادہ کو خارج کر دیتا ہے۔ جس سے روح اور جسم میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔

پیدل چلنے سے تمام اعضاء حرکت میں آتے ہیں۔ خون کا دوران بڑھتا ہے۔ جسم چست و چالاک ہوتا ہے۔ قبض کی شکایت دور ہوتی ہے۔ جگر اور معدہ کا فعل درست ہوتا ہے۔ بھوک خوب لگتی ہے۔ جسم میں توانائی آتی ہے۔ چہرہ پر تازگی پیدا ہوتی ہے۔ جو کھاؤ ہضم ہوتا ہے۔ اور یہ اس دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے۔

پیدل چلنے پھرنے کا فائدہ اُس وقت معلوم ہوتا ہے جب کہ انسان چلنے پھرنے میں اپنے جسم کے تمام اعضاء سے کام لے مضبوط اور تندرست آدمی کی طرح چلے پھرے۔ یہ نہ ہو کہ مرزا پھویا کی طرح گن گن کر اس طرح قدم رکھے جائیں کہ پیٹ کا پانی نہ ہلے۔ کیونکہ نزاکت کے ساتھ قدم اٹھانا پیدل چلنے میں شمار نہیں ہو سکتا۔ اور

اس طرح پیدل چلنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ اُلٹا وقت کا فضول برباد کرنا اور تھکنا ہے۔ پیدل چلو پھرو۔ اور اس طرح چلو پھرو کہ آگے قدم رکھنے میں تمہارا سینہ آگے نکلا ہوا ہو۔ ہاتھوں کو پوری جنبش ہو۔ پہلو حرکت میں آئیں۔ پاؤں اور ٹانگیں حرکت کریں۔ سر اور گردن جسم کے ساتھ گردش میں آئیں۔ اور ساتھ ہی سانس کی آمد و رفت معمول سے بڑھ جائے۔ اس طرح پیدل چلنے سے جسم کے ہر حصہ کی ورزش بھی ہوگی اور اس کا اثر صحت اور تندرستی پر بہت اچھا ہوگا۔

صبح پیدل چلنے اور ہوا خوری کرنے میں اگر جسم کے ہر حصہ سے کام لیا گیا اور اعضائِ جسم کو حرکت دی گئی اور جسم کا ہر حصہ متاثر ہوا تو ہوا خوری کے فوائد معلوم ہوں گے۔ اور تمہارا جسم نہایت چست و چالاک ہوگا کام میں جی لگے گا۔ کھانا ہضم ہوگا۔ صحیح بھوک لگے گی۔ اور اگر اس کے خلاف تم نے ہوا خوری کی تو یقیناً تم نے اپنا قیمتی وقت ضائع کیا۔ جس سے تمہارے جسم کو کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا۔

اب میں پیدل چلنے کے نقصانات بھی بتاتا ہوں۔ تاکہ آپ اُن سے محفوظ رہ سکیں۔ پیدل چلنا اگرچہ بذاتِ خود بہت مفید ہے۔ لیکن اکثر حالات میں اس سے اخلاقی معاشرتی۔ تمدنی خرابیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

بعض لوگ چند پیسوں یا چند آنوں کی بچت کے خیال سے ضروری کاموں کو بھی پیدل چل کر انجام دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی کیفیت شعاری

تمدنی اور معاشرتی اخلاقی اعتبار سے بہت مذموم ہے۔ کیونکہ اس طرح پیدل چلنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ البتہ خاک کے ذرّے منہ اور ناک کے راستے سے بغیر محسوس طریقہ سے جسم میں داخل ہو کر پھیپھڑوں کو نقصان پہنچاتے ہیں اور اس سے خوفناک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سواری کی گرانی انسان کو پیدل چلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لیکن اس گرانی کے مقابلہ میں دیر سے پہنچنے کے سبب جو نقصان ہو جاتا ہے اس کو نہ برداشت کیا جاتا ہے اور نہ اس کی تلافی ہو سکتی ہے۔ مثلاً آپ کو کسی پارٹی میں یا جلسہ میں شریک ہونا ہے یا کچہری جانا ہے یا کاروباری سلسلہ میں کسی سے ملنے جانا اور وقت پر پہونچنا ضروری ہے۔ اور پیدل چلنے کے سبب سے دیر ہو گئی یا کوئی حادثہ راستہ میں چلنے کی وجہ سے پیش آگیا۔ یا کوئی بے تکلف دوست مل گئے اور ان سے باتیں کرنے میں وقت گزر گیا اور جس غرض سے آپ جا رہے ہیں وہ فوت ہو گئی۔ اور اس طرح سواری کے چند پیسے بچانے میں ایسا شدید نقصان ہوا کہ اس کی تلافی قطعی ناممکن ہے اور کاروبار کے سلسلہ میں پیدل چلنا پھرنا اس اعتبار سے بھی معیوب ہے کہ اس خفیف سی بچت کا اثر ہر شخص کی کاروباری حیثیت پر پڑتا ہے ایک خوش حال اور دولت مند سوداگر اپنی حیثیت اور کاروباری شان کا خیال نہ کرے اور پیدل چل پھر کر اپنے کاموں کو انجام دے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی کاروباری شخصیت اپنے سے کاروبار کرنے

والوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاتی ہے۔ اور اس کا اثر کاروبار پر بھی برابر پڑتا ہے۔

مثلاً کوئی بڑا کاروباری آدمی یا کوئی معزز عہدہ دار آپ سے ملنے آتا ہے یا آپ کسی ایسے ہی شخص سے ملنے جاتے ہیں تو کیا آپ کا اخلاقی فرض یہ ہے کہ آپ شہر کی سڑکوں کا طواف کرتے ہوئے خاک پھانکتے ہوئے۔ جوتیاں چٹخاتے ہوئے اس کے پاس پہنچیں یا اُس کو اپنے ہمراہ لے کر شہر کی گندی اور متعفن نالیاں دکھاتے پھریں۔ بلکہ اخلاق یہ چاہتا ہے کہ جس حیثیت کا وہ شخص ہے۔ اس سے ویسا ہی برتاؤ کریں اور پھر اپنی حیثیت کے مطابق سواری کا انتظام کریں۔ تاکہ وہ آپ کے کاروبار کی اہمیت سے متاثر ہو۔ اور اس کا آپ کے کاروبار سے متاثر ہونا ہر حیثیت سے آپ کے لئے فائدہ مند ہے۔

غرضکہ پیدل چلنا ضرور مفید ہے۔ لیکن ہر موقعہ اور محل پر نہیں بلکہ بعض اوقات پیدل چلنا، اخلاق۔ تمدن۔ معاشرت کے بھی خلاف ہوتا ہے اور بعض اوقات تہذیب سے گرا ہوا اور معیوب بھی ہے ہر کام کو وقت اور حالات اور ضرورت کے مطابق اور اخلاق و تمدن و معاشرت کے مناسب کرنا چاہیئے۔

اب میں پیدل چلنے کی مشکلات بیان کرتا ہوں جو ترقی یافتہ شہر و دل خصوصاً دہلی کی سڑکوں پر پیدل چلنے پھرنے والوں کو دن رات پیش

آتی رہتی ہیں۔ ان مشکلات کی کچھ ذمہ داری خود پیدل چلنے والوں پر ہے اور کچھ میونسپلٹی اور پولیس والوں پر ہے۔ اور افسوس ہے کہ ان مشکلات کا خاتمہ کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

پیدل چلنے کی مشکلات چھوٹے شہروں میں جہاں تہذیب ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے کم ہیں۔ مگر بڑے شہروں میں زیادہ ہیں۔ اور جوں جوں آمد و رفت کے وسائل ترقی کر رہے ہیں پیدل چلنے والوں کی مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور خدا ہی کو علم ہے کہ تہذیب و ترقی کا یہ مسافر کس منزل پر قیام پذیر ہوگا؟

بڑے بڑے شہروں میں زیادہ آمد و رفت کے لئے بیسیوں قسم کی سواریاں ہیں۔ جو پیدل چلنے والوں کے سدّ راہ ہوتی ہیں۔ ذرا آنکھ بچی یا راہ گیر نے اِدھر اُدھر دیکھا فوراً کسی سواری سے ٹکر ہوئی۔ شتر بے مہار سائیکل سواروں کی گھنٹیاں۔ موٹر کاروں کے ہارن۔ تانگوں یکّوں۔ گاڑی گھوڑوں کی ہٹو بچو کی آوازیں سکون سے سیدھا راستہ چلنے کی مہلت نہیں دیتیں۔

سڑک پر پیدل چلنا بسا اوقات اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ سڑک کے کنارے۔ دوکانوں کے آگے دوکانداروں نے ان پٹڑیوں پر جو راہ گیروں کے لئے بنائی گئی ہیں اپنے مال کو سجانے کے لئے تخت بچھا رکھے ہیں۔ تختوں کے آگے چھپیے والے اور اپاہج کوڑھی جذامی فقیر اپنی اپنی دوکانیں لگائے بیٹھے ہیں۔ خاصی چوڑی سڑک ہے

مگر اس طریقہ سے دور دیہ جب وہ رُکی رہتی ہے تو پیدل راستہ چلنے والوں
اور موٹروں ۔ سائیکلوں ۔ تانگوں اور چھکڑوں کے لئے سڑک پر صرف
ایک پتلی سی نالی باقی رہ جاتی ہے ۔ جس پر روزانہ خوفناک تصادم ہوتے
رہتے ہیں ۔ اور بیچارے پیدل چلنے والے ان امیروں کی سواریوں کے
لئے اپنی جان نذر کر دیتے ہیں ۔ اور اگر اتفاق سے آپ ان سواریوں
سے جان بچانے میں کامیاب ہو گئے تو یہ قطعی ناممکن ہے کہ ان سواریوں
کے مالکوں یا ان کے چلانے والوں کے تند و تیز فقرے اور توہین آمیز
الفاظ سے اپنی آبرو بچا سکیں ۔ خصوصاً تانگہ والے تو نہایت حاکمانہ
بدتمیزی سے پیدل چلنے والوں کو مخاطب کرتے ہیں ۔ جو انسانیت کی
توہین ہے اور اس کے ساتھ ہی اگر کیچڑ ہے ۔ یا سڑک کے کچھ حصہ میں پانی
جمع ہے تو چاہے آپ کیسے ہی صاف ستھرے کپڑے پہن کر آئے ہوں
آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے ۔ پلک جھپکانے میں اگر یہ نہیں تو
گدھے یا گھوڑے کے پیشاب اور گاڑی بھینس کے گوبر سے کپڑوں کا
بچنا قطعی ناممکن ہے ۔

آپ خواہ کسی حیثیت کے انسان ہوں ۔ لیکن پیدل چلنے کی صورت
میں موٹر ڈرائیوروں ۔ تانگہ والوں ۔ سائیکل سواروں کی نگاہ میں آپ
ایک ذلیل انسان بن جاتے ہیں ۔ کیونکہ جب اپنی یا سواری والے کی
غلطی سے اس کی زد میں آئیں گے ، وہی ذلیل سواری والا جس سے
آپ مخاطب ہونا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہوں گے ، نہایت ہی

حاکمانہ انداز میں آپ کو متنبہ کرے گا۔ اور آپ کی پوزیشن کی اور اپنی غلطی کی قطعی پرواہ نہ کرے گا۔

اگر آپ راستے چلتے ہوئے ایک منٹ کے لئے بھی کہیں ٹھہر گئے تو آپ کا سابقہ چند ایسی جماعتوں سے پڑے گا جو اس ملک اور مہذب سوسائٹی کے لئے اس آسمان کے نیچے سب سے بڑی لعنت ہیں اور جو پلیگ کی طرح اس غریب ملک میں پھیل کر شرفا کے لئے بہت بڑی مصیبت ہیں۔ آپ خواہ کیسے ہی اپنے کام میں مستغرق ہوں فوراً یہ آواز آپ کو اپنی جانب متوجہ کرے گی۔ جس میں پہلا نمبر پالش والوں کا ہے۔ بابوجی جوتہ بنادوں۔ بابوجی پالش کردوں۔ بوٹ پالش۔ ایک پیسہ میں جوڑا چمکا دوں گا

یہ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے بچہ چمار آپ سے بھڑنے کی کوشش کرے گا۔ اگر آپ کو اپنے کپڑے صاف رکھنے ہیں تو خود بچنے کی کوشش کیجیے۔ ورنہ یہ تو آپ کی کریم النفسی اور آپ کے اخلاق کی آزمائش کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔

دوسرا نمبر گداگروں کا ہے جو راہ گیر کے لئے اور اس شہر کے لئے ایک مستقل لعنت ہیں۔ جدھر دیکھو یہ ہٹے کٹے۔ مسٹنڈے۔ بھیک مانگتے نظر آئیں گے۔ جس میں کچھ تو آپ کے اخلاق کریمانہ سے اپیل کریں گے۔ اور بعض بدتمیز تو گالیاں دے کر خیرات کا خراج وصول کرتے ہیں جن کو ایک پائی کا دینا ثواب کی بجائے گناہ اور پاپ ہے۔ اور گناہ اور

معصیت کی امداد ہے۔ کیونکہ ان میں اٹھانوے فی صدی جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ جو دن کو بھیک مانگتے اور رات کو نقب زنی کرتے ہیں۔ اور معصوم بچوں کو زیور کے لالچ میں گلے گھونٹ کر لاش کنوئیں میں پھینک دیتے ہیں۔ اور بے گناہ بچوں کو اغوا کر کے دوسرے شہروں میں لے جا کر فروخت کرتے ہیں۔ اور خیرات کرنے والوں کے روپے سے شراب پیتے ہیں۔ افیون کھاتے ہیں۔ چانڈو اور چرس پیتے ہیں۔ زناکاری بھی کرتے ہیں۔ اور ان تمام گناہوں کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جو اُن مصنوعی فقیروں کو بھیک دیتے ہیں۔

تیسرا نمبر تیل مالش کرنے والوں کا ہوتا ہے جو ہر سڑک۔ رسٹورنٹ ہوٹل۔ پارک میں بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو کر پیدل چلنے والوں کے لئے روک راستہ کا کام دیتے ہیں۔

چوتھی جماعت چھابے والوں اور خوانچہ والوں کی ہے۔ جو سڑک کے کنارے راستہ روک کر حادثات پیش آنے کی ذمہ دار ہے۔ کیونکہ جب تنگ سڑکوں پر خوانچہ والے سودا فروخت کریں گے تو موٹروں تانگوں۔ چھکڑوں اور پیدل راستہ چلنے والوں میں تصادم یقینی ہے۔

پانچواں نمبر خود پیدل چلنے والوں کا ہے۔ جن میں نوے فیصدی پیدل راستہ چلنے کے قواعد سے ناواقف ہوتے ہیں۔ یعنی راستہ چلنا چاہیئے دائیں ہاتھ کو مگر چل رہے ہیں بائیں ہاتھ کو۔ ایسی صورت میں تصادم نہ ہو تو کیا ہو۔ تانگہ والا آواز دے رہا ہے۔ موٹر والا

ہارن دے رہا ہے ۔ لیکن پیدل صاحب سننے اور دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے ۔ اس حالت میں بھی تصادم لقینی ہے ۔

بہر حال پیدل پھرنا آسان ۔ مفید ۔ کم خرچ اور خطرناک بھی ہے اور نفع بخش اور کم خرچ بالانشیں بھی ۔ اب یہ آپ کی مرضی اور سمجھ اور ضرورت پر منحصر ہے کہ آپ پیدل چلتے ہیں یا سواری ہیں ۔

ہماری عید

(۵۷)

ہم ہر روز صبح چھ بجے اُٹھتے تھے۔ عادت سے مجبور ہو کر آج بھی اُٹھے۔ ہماری بیگم صاحبہ جنھیں ہم "مسز ہم" کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ آج بھی ہم سے بیشتر بیدار ہو کر نماز میں مصروف تھیں۔ نہیں نماز پڑھنے کے بعد ہاتھ اُٹھا کر خدا جانے کیا کیا دعائیں مانگ رہی تھیں۔ ہم سمجھے "مسٹر رمضان" کی روانگی پر اظہار مسرت ہو رہا ہے۔ بے سوچے سمجھے جھٹ "آمین" کا نعرہ لگا بیٹھے۔ "مسز ہم" نے فرمایا "آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے کیا دعا مانگی ہے؟ ہم نے گزشتہ تجربات کی بناء پر بے تکلف کہدیا "دعا کیا مانگی ہوگی۔ یہی کوئی سونے کا ڈیزائن یا کوئی ریشمی سوٹ۔ بیگم صاحبہ برہم ہو گئیں۔ اور فرمایا "میں نے دعا مانگی ہے کہ اللہ میاں انھیں نیک ہدایت دے۔ آج عید کے دن تو کم از کم انھیں توفیق دے کہ عید کی نماز پڑھ لیں۔" ہم نے کہا بہت اچھا۔ نماز یا دوگانہ ہم پر فرض نہیں۔ (اس لئے کہ ہم چودھویں صدی کے مسلمان ہیں) مگر خیر چونکہ اپنی زبان مبارک سے ہم "آمین" کہہ چکے ہیں، اس لئے ہم مسجد میں چلے جائینگے آخر ہم زبان کے پکے اور وعدے کے سچے ہیں۔ لاؤ ذرا ہمارا اپنا سوٹ تو نکال دو۔" بیگم صاحبہ نے جواب دیا "آج سوٹ ووٹ رہنے دو۔ آج تو

شیر دانی اور پاجامہ کا دن ہے۔ ہم نے کہا اچھا لاؤ یہی سہی۔ آج ذرا تمہیں ہی خوش کر دیں۔ تم بھی کیا یاد کرو گی کہ ملا خوجی کی بیوی بنی تھیں۔

دوسرے کمرے سے آواز آئی "ابا آج ہمیں کھلونے ہی دلانا!" ہم نے نہایت سنجیدگی سے مگر ذرا اکڑ کر فرمایا "چپ بے گدھے کے بچے!" جواب آیا "یہ تو سچ ہے۔ مگر کھلونوں میں تو گدھا ہوتا ہی نہیں۔ ہمیں تو ایک گھوڑا اور ایک ربڑ کا ہاتھی دلا دینا۔ ہم نے کہا اچھا! اگر تو اس شعر کا مطلب بتا دے گا تو جو کچھ تو کہے گا ہم دلا دیں گے۔ ہم نے شعر پڑھا

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

صاحبزادے کچھ دیر تک تو سوچتے رہے۔ پھر کہنے لگے اس شعر کا مطلب بہت آسان ہے۔ یعنی صرف اتنا کہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی (محکمہ تعمیرات) میں ملازم ہو جاؤ۔ ہم نے کہا شاباش۔ بیشک اب تو ہمارا بیٹا ہے۔ جواب ملا "اب مجھے گدھے کا بچہ نہ کہنا۔

بیگم صاحبہ تشریف لائیں۔ اور فرمایا۔ لائیے مجھے فطرے کے دو روپے عنایت کیجئے۔ ایک بڑھیا آئی ہے۔ اسے دیدوں یا جامع مسجد کے امام جی کو بھیجدوں۔ ہم نے کہا دیکھو دین کے معاملات میں شرکت نہیں۔ اپنی اپنی قبر اور اپنا اپنا جواب ہے۔ تم اپنے پیسے جسے چاہو دیدو۔ مگر ہم تو اپنا فطرہ

مس کین (Miss Keen) کو دوں گا مسکینوں کا بڑا حق ہے۔ مس کین کا نام سنتے ہی خدا جانے بیگم صاحبہ کی آنکھوں کے سامنے کون کونسے منظاہرے آ گئے۔ فوراً برہم ہو گئیں اور جیسی روح ویسے فرشتے کہتی ہوئی میز پر سے بٹوا اُٹھا کر چل دیں۔ غسل سے فارغ ہو کر ہم نے بیگم صاحبہ کے انتخاب کے مطابق کپڑے پہنے۔ چاء پی۔ پان کھایا۔ اور عید گاہ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ عادت بھی بُری چیز ہے۔ چلتے چلتے خیال آیا کہ منہ میں پان ہے۔ پھر واپس آ گئے۔ دانت اور ہونٹ صاف کرنا چاہتے تھے۔ کہ بیگم صاحبہ نے یاد دلا دیا کہ اب کیا ڈر ہے۔ اب تو رمضان رخصت ہو گیا۔

عید گاہ میں پہونچے تو دیکھا کہ چند مسلمان صورت انسان وضو کرنے میں مصروف ہیں۔ اب یاد آیا کہ "خیر سے ہم نے وضو تو کیا ہی نہیں۔ چاروں طرف نظر دوڑا کر پانی اور لوٹے کی تلاش کرنے لگے۔ اتنے میں تکبیر کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم بے وضو ہی دوڑ کر ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ تکبیریں گونج رہی تھیں کہ دائیں کو دیکھا تو ہر تکبیر پر ہاتھ اُٹھ رہے تھے۔ بائیں طرف نظر دوڑائی تو ہاتھ بندھے تھے۔ گردنیں ہل رہی تھیں۔ حیران تھے الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ خیر جوں توں کر کے نماز پڑھی۔ دعا مانگ کر کھڑے ہوئے تو ایک سفید ریش بزرگ نے فرمایا۔ جناب پاجامہ ٹخنوں سے اونچا پہنا کیجیے۔ ایک اور صاحب بولے آئندہ جب عید کی نماز پڑھنے آئیے تو عید کی نماز سیکھ کر تیسرے

صاحب نے کہا، اجی ان ڈاڑھی منڈوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ہمیں ان باتوں پر غصّہ تو بہت آیا۔ مگر یہ سمجھکر چپ ہو رہے کہ "جواب جاہلاں باشد خموشی" آئندہ نہ نماز کو آئیں گے نہ یہ باتیں سنیں گے۔

امام صاحب، حافظ صاحب، حاجی صاحب۔ مولوی صاحب۔ مفتی صاحب۔ وغیرہ احباب عید ملنے کے لئے آ گئے۔ گھر میں جو کچھ پکا تھا سب ختم ہو گیا۔ چار اور پان کا دور ہو چکا۔ سگاروں کا نمبر آیا۔ تاش نکالے گئے۔ پیسوں سے آنوں پر اور آنوں سے روپیوں پر نوبت آئی۔ حاجی صاحب نے معقول رقم جمع کر لی۔ اور چار بجے تاش بند ہوا۔ سوال پیدا ہوا آج شام کو کیا کرنا چاہئیے۔ امام صاحب نے ذہرہ جان کا نام پیش کیا۔ حافظ صاحب نے لالی بائی۔ مفتی صاحب نے منی جان کی سفارش کی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ چہاں سینگ سمائیں وہاں چل بیٹھو، روانہ ہو گئے۔

"باقی بصیغۂ راز"

یہ ہے موجودہ دور کے مسلمانوں کی عید کی مقدس سرگذشت

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

لیبر لیڈر

(۵۸)

دنیا میں بیوقوفوں کی کوئی کمی نہیں۔
میں ایک شاندار کوٹھی میں رہتا ہوں۔
میرے یہاں درجنوں ملازم ہیں۔
میں روزانہ رولس رائس موٹر میں سیر کے لئے نکلتا ہوں۔
میں یورپ کے پُرتکلف ہوٹلوں میں ہندوستانی امارت کے کرشمے دکھاتا ہوں۔
ان احمقوں سے کوئی پوچھے کہ وہ مجھ پر اعتراض کیوں کرتے ہیں۔
مجھے ان تمام باتوں کا حق حاصل ہے اس لئے کہ میں لیبر لیڈر ہوں۔
ابھی چند روز کی بات ہے کہ جب میں ایک انگریزی کارخانے میں بابوگری کے لئے گیا تو میں نے نہایت ادب کے ساتھ بڑے صاحب کی خدمت میں اپنی درخواست کا نذرانہ پیش کیا تھا اور اپنی مصیبتوں کی داستان الف سے ی تک سنائی تھی۔ لیکن بڑے صاحب آخر تھے نہ سفید رنگ کے۔ اُنھوں نے میری خوشامدوں کے جواب میں "یور ایکسیلنسی" کی ٹھوکر اس زور سے رسید کی کہ میری تمام تمناؤں کی تلّی پھٹ گئی۔ لیکن .... آج ......"

وہی بڑے صاحب میرے یہاں ہر مہینے ڈنر پر آتے ہیں۔ اور مجھ سے ڈرتے ہیں۔ کہ میں کہیں اُن کے کارخانہ میں ہڑتال نہ کرا دوں۔ واہ ری قسمت کی نیرنگیاں۔

وہ تو خدا بھلا کرے نانی نصیبن کی زنگ آلودہ سوئی کا۔ انھوں نے بی ہمسائی کے یہاں اٹھواروں آنکھیں پھوڑ کر آٹھ دس آنے کی سلائی کی اور چار آنے ہمارے بھی ہتے چڑھ گئے۔ ہمیں یہ پیسے کیا ملے۔ گویا قارون کے خزانے کی چابی مل گئی۔ شہر میں مسلم لیگ والوں کو خوب شان و شوکت کے ساتھ پھرتے دیکھ کر ہمیں عرصہ سے اس دفینہ کا سراغ معلوم کرنے کی جستجو تھی۔ سیدھے مسلم لیگ کے دفتر میں گئے اور دو آنے میں سال بھر کی ممبری خرید کر واپس چلے آئے۔ نانی نصیبن تو یہ سمجھی تھیں کہ میرا نواسہ ان پیسوں سے بٹیر لڑائے گا۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ ہم نے ان کی گاڑھی کمائی کا پیسہ مسلم لیگیوں کی نذر کر دیا۔ تو انھوں نے سر پیٹ لیا اور کہنے لگیں "ہے ہے بیٹا میں نے تو یہ پیسے تجھے شوق پورا کرنے کے لئے دیئے تھے۔ تو نے یہ کیا غضب کیا؟ اب نگوڑے انگریز تجھے قید کر دیں گے"! ہم نے اپنی دم بریدہ مونچھوں پر تاؤ دے کر جواب دیا "نانی اماں! رنج کیوں کرتی ہو۔ اب ہم لیڈر ہیں لیڈر۔ اچھا اب تم کہیں سے فکر کر کے ہمیں کھدر کا ایک جوڑا تو بنوا دو۔ اور ہاں دیکھو ٹوپی بھی، تین چار آنے سے کم نہیں ملے گی۔ اسکا بھی انتظام کر دینا"

معاملہ کی بات میں کوئی شرم نہیں۔ ہم کو روپے کی جستجو تھی اور لیگ والوں کو اپنی ہاں میں ہاں ملانے والے کی تلاش تھوڑے ہی عرصے کے بعد دست غیب کا منتر قبضہ میں آگیا۔ شہر میں چار جانب ہمارا ڈنکہ بج رہا تھا۔ اور ہم اسٹیج پر ہندوؤں کی فرقہ پرستی کا رونا خوب روتے تھے۔

ایک مرتبہ مہاسبھا کے والنٹیروں نے مساجد کے سامنے باجہ بجانے پر ستیہ گرہ کی۔ ہم نے جہاد اسلامی کی یاد تازہ کرتے ہوئے باجہ رکوا۔ دھرے گئے۔ عدالت نے نقص امن کی پاداش میں ایک سال قید کی سزا ٹھونک دی۔ یہ قید کا زمانہ جس مصیبت سے کٹا ہے بس ہمیں جانتے ہیں۔ لیکن نانی نصیبن کی چاندی تھی۔ انھیں مسلم لیگ فنڈ سے برابر تنخواہ ملتی تھی۔ یوں تو ہمیں بھی جیل خانہ میں کوئی تکلیف نہ تھی لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں کی کوشش سے ہمارے ساتھ خاص برتاؤ ہوتا تھا۔ اور اگر خاص برتاؤ نہ بھی ہوتا تو کیا حرج تھا۔ انگریز نہایت منصف مزاج ہے۔ جس وقت جیل خانے کے جیلر کو یہ معلوم ہوا کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی حفاظت کی تو اس کا سر عقیدت سے ہمارے قدموں پر جھک گیا۔ لیکن قید خانہ میں ہمیں سب سے بڑی تکلیف یہ تھی کہ ہم قید خانہ میں تھے۔ اور ہماری آمدنی میں فرق آرہا تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح ہم اپنی میعاد سزا سے چھ ماہ پیشتر ہی رہا ہو گئے ــــ اب کیا تھا۔ قوم نے ہم کو اپنی پرستش کا مجسمہ بنا لیا اور

پابند اصول ہیں۔ اور ہمارے ہاں تنخواہیں دوسرے مہینے کی بیس تاریخ کو تقسیم ہوتی ہیں۔ ہم نے اس سے صاف کہدیا کہ تم جاؤ۔ ہم پیشگی تنخواہ نہیں دے سکتے۔ آج سات تاریخ ہے۔ تنخواہ تیرہ دن بعد ملے گی۔ اور ایک ہفتہ رخصت کی تنخواہ کاٹ لی جائے گی۔ کم بخت ملازم بھی ہمارے معترضین کی طرح عقل سے کورا تھا۔ اُس نے رو کر کہا، حضور میرا بچہ مر رہا ہے مہینہ بھی ختم ہو گیا۔ آج سات تاریخ ہے۔ تنخواہ دیدیجیے۔ جان و مال کو دعائیں دوں گا۔ میں ایک ایک پیسہ کو محتاج ہوں۔ اور حضور کی برسوں خدمت کی ہے۔ رخصت تو میرا حق بھی ہے۔" بس حق کا نام سننا تھا کہ ہمارے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مارے بیدوں کے گستاخ ملازم کی کھال اُدھیڑ دی۔ پندرہ دن کی تنخواہ یعنی پانچ روپے جرمانہ کر دئیے گئے اس سے بڑھکر ایثار اور کیا ہو سکتا ہے۔

آخر ہوں نہ "لیبر لیڈر"

ہم سند یافتہ لیڈر تھے۔ ستیہ آگرہ کرنے میں پھر جیل کا سامنا تھا۔ اس لئے ہم نے اب اپنی عنانِ توجہ غریب مزدوروں کی جانب منعطف کی۔ ادھر کارخانوں کے مزدور اپنی کمائی میں ہمارا بھی حصہ لگاتے تھے۔ دوسری طرف کارخانوں کے مالک ہماری مٹھی گرم کرتے تھے۔ کہ ہم کہیں اُن کے ہاں ہڑتال نہ کرا دیں۔

اب کوئی دنیا بھر کے بیوقوفوں سے پوچھے کہ انھیں ہماری شان وشوکت پر اعتراض کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ ہم نے یہ دولت مفت میں پیدا نہیں کی۔ بلکہ اس کے لئے بہت کچھ پاپڑ بیلے ہیں۔ اور پھر اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس دولت کو تلف کر دیتا۔ لیکن ہم ایثار کرتے ہیں۔ قربانی سے کام لیتے ہیں۔ لوگوں سے بھیک مانگ مانگ کر خرچ کرتے ہیں۔ لیکن اپنی جمع کی ہوئی رقم کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ ہماری کفایت شعاری اور ہمارے ایثار کا اندازہ اُس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ پچھلے ہفتہ ہمارے ایک ملازم نے تین برس مسلسل خدمت کرنے کے بعد ہم سے آٹھ دن کی رخصت طلب کی۔ وطن میں اس کا اکلوتا بچہ سخت بیمار تھا۔ ہم نے اُسے بہت کچھ سمجھایا کہ بیوقوف دنیا میں بچے پیدا بھی ہوتے ہیں مرتے بھی ہیں۔ تو جا کر کیا کرے گا۔ لیکن وہ نہ مانا۔ چونکہ ہم غریبوں کے ہمدرد لیڈر رہے ہیں۔ اس لئے ہم نے اُسے رخصت عطا کر دی۔ لیکن جب اس نے چلتے وقت ہم سے گڑگڑا کر پیشگی تنخواہ طلب کی۔ تو ہمارے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس لئے کہ ہم نہایت

آنریری مجسٹریٹ

(۵۹)

میری عزت اور میرے اقتدار کا کیا پوچھنا......
آنریری مجسٹریٹ ہوں، آنریری مجسٹریٹ۔

جس وقت میں گھر سے باہر نکلتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک معظم کا حقیقی جانشین جا رہا ہے۔ عزت دوڑ دوڑ کر میرے اس جوتے پر جو مجھے کسی جفت فروش نے بطور "نذرانہ" دیا تھا، پالش کرتی ہے۔

کوٹ پتلون اور زرق برق شیروانیاں پہننے والے یا کچھ روش، یا ان خودسر بے وقوفوں کی تعداد انگلیوں پر شمار کی جاسکتی ہے۔ یہ مجھے سلام کیا کریں گے۔ میں خود ہی ان کو منہ نہیں لگاتا۔ اور اگر چند لکھے پڑھے میری بات نہ پوچھیں تو میری عزت میں کیا فرق آسکتا ہے۔ جب کہ شہر میں ہزاروں تانگے والے۔ یکّہ والے۔ ٹھیلہ والے۔ کنجڑے۔ قصائی۔ دھوبی۔ بہشتی۔ تنبولی وغیرہ وغیرہ مجھے جھک جھک کر سلام کرتے ہیں

میری تعلیمی قابلیت اور فضل و کمال کا کیا پوچھنا.....
آنریری مجسٹریٹ ہوں۔ آنریری مجسٹریٹ۔

بھلا ہماری بیدار مغز سرکار کہیں کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو جلیل القدر منصب عطا کر سکتی ہے۔ مجھے کسی دستخطی ڈگری کی ضرورت

نہیں۔ میرا آنریری مجسٹریٹ ہونا ہی اس بات کا زبردست ثبوت ہے کہ تمام شہر میں میری ہستی سب سے زیادہ قابل۔ تعلیم یافتہ اور برگزیدہ ہے
خدا بخشے ابّا جان مرحوم کو انھوں نے مجھے کریما۔ مامقیماں۔ آمدنامہ
پڑھا دیا۔ لیکن اس نئے زمانہ میں ان دقیانوسی چیزوں کو یاد رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ہندی یعنی سنگھٹیوں کی زبان تو میں قیامت تک نہ سیکھوں گا۔ رہی انگریزی سو یہ ہمارے "مائی باپ سرکار" کی زبان ضرور ہے۔ لیکن ...... لیکن ...... میں اس معاملہ میں ...... حضرت اس معاملہ میں کانگریس والوں کے ساتھ ہوں۔ یعنی بدیشی زبان پڑھنا شان قومیت کے خلاف ہے۔

اب سوال باقی رہا اردو لکھنے کا۔ سو بھائی میرا خیال یہ ہے کہ انسان جو چیز حاصل کرے بدرجہ اتم حاصل کرے۔ ورنہ اس چیز کو حاصل نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ اردو کی دو چار آڑی ترچھی سطریں لکھنے سے فائدہ؟ کم سے کم ایسا تو ہو کہ ایک مرتبہ یاقوت رقم بھی غیرت سے زہر کھا کر مر جائے۔
اس زمانہ میں قحط الرجال ہے۔ کوئی اچھا خوش نویس مجھے ابتک ملا ہی نہیں۔ اس لئے لکھنا سیکھنے کا سلسلہ میں نے معرضِ التوا میں ڈال دیا ہے۔

میری قانونی موشگافیوں کا کیا پوچھنا ....

آنریری مجسٹریٹ ہوں، آنریری مجسٹریٹ!

میرا قول ہے کہ چھوڑنا کام چڑیمار کا جس وقت کوئی شخص ملزم کے

کٹھرے میں کھڑا ہو جائے تو وہ یقیناً بدمعاش ہے۔ بھلا کہیں سرکار بہادر کی پولس جھوٹ بول سکتی ہے میری عدالت میں کسی گواہ وشاہد کی ضرورت نہیں۔ سرکاری آدمیوں پر اعتماد کرتا ہوں۔

ایک دفعہ میرے اجلاس میں ایک سفید پوش عرف جنٹلمین کا مقدمہ پیش ہوا۔ پولس کا بیان تھا کہ اس شخص کے ہاں چوری کی میز برآمد ہوئی ہے۔ وہ بیوقوف جنٹلمین یہ کہتا تھا کہ میں نے میز گدڑی بازار سے خریدی ہے۔ آدمی تھا کوئی بگڑے دل۔ اور یہ لکھے پڑھے بیوقوف ہمیشہ بگڑے دل ہوتے ہیں۔ اس نے اپنی صفائی میں درجنوں گواہ پیش کیے۔ اور مبلغ کئی عدد وکیلوں۔ بیرسٹروں کو پیروی کے لیے مقرر کیا۔

ان کرایہ کے حمائتیوں نے اپنے موکل کی بریت میں طول طویل اور فضول بحثیں شروع کیں۔ اور ہمارے اجلاس کو قانونی کتابوں سے پاٹ دیا۔ بیوقوف بیرسٹروں کو اتنی سمجھ نہ آئی کہ ہم سرکار بہادر کے آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ کوئی بچے نہیں جو ہمیں قانونی مسئلے سمجھائے جائیں۔ ایں جانب اپنے ذہن رسا سے فوراً اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ ملزم در حقیقت بدمعاش ہے۔ لکھے پڑھے جنٹلمین ہمیشہ بدمعاش ہوتے ہیں۔ جو شخص ایک آنریری مجسٹریٹ کو راستہ میں۔ گلی میں جھک جھک کر سلام نہ کرے اس کی بدمعاشی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

ہم نے چور کے حمائتیوں سے ڈانٹ کر کہا۔ بس بحث بند کرو۔ اور تھانہ دار صاحب سے کہا کہ "داروغہ جی کیا یہ شخص چور ہے؟ داروغہ

صاحب نے نہایت ادب کے ساتھ ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ "جی ہاں حضور یہ چور ہے۔ غریب نواز اگر چور نہ ہوتا تو ہم گرفتار ہی کیوں کرتے"۔ ہم محبت کے بندے ہیں۔ ایک تھانہ دار کا یہ ادب و لحاظ دیکھ کر ہمارا دل اس کی لال پگڑی پر قربان ہو گیا۔ اور بے ساختہ جی میں آیا کہ اپنی مجسٹریٹی کے تمام اختیارات اس با ادب اور شریف تھانہ دار کو عطا کر دیں ہم نے کہا داروغہ صاحب پھر آپ پوچھتے کیا ہیں، اس بدمعاش کو فوراً جیلخانہ بھیجئے، تھانہ دار نے عرض کیا "حضور فیصلہ لکھ دیں"۔ ہم نے سر کھجا کر داروغہ صاحب کی طرف محبت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور کہا "آپ کو اختیار ہے، جتنے عرصہ کیلئے آپ چاہیں اس بدمعاش کو جیلخانہ بھیج دیں"۔ اور فوراً ملازم سے کہا کہ "تم ہمارے بھائی داروغہ صاحب کے ساتھ جاؤ۔ یہ تم کو جتنے عرصہ کی چاہیں سزا دے سکتے ہیں۔ داروغہ نے پھر کہا "حضور فیصلہ لکھ دیں"۔ ہم نے پھر یہی جواب دیا کہ "واللہ داروغہ صاحب آپ بھی مغائرت برتتے ہیں ایسے صاحب کہیں میں اور آپ علیحدہ ہیں۔ آپ کا فیصلہ میرا فیصلہ ہے اور آپ کی زبان میری زبان"۔ داروغہ صاحب مجبور ہو کر ملزم کو اپنے ہمراہ باہر لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر تشریف لے آئے۔ اور ہم سے کہنے لگے۔ "حضور یہ ہے تو بدمعاش ..... ہم نے بات کاٹ کر کہا۔ "ہاں یہ ہے تو بدمعاش"۔ داروغہ جی نے عرض کیا "لیکن حضور یہ ایک شریف خاندان کا تعلیم یافتہ نوجوان ہے ..... ہم نے کہا "ہاں یہ ایک شریف خاندان کا تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ داروغہ نے دست بستہ گذارش کی "حضور اسکی خطا معاف کر دیجائے ...." ہم نے بھی کہا اسکی خطا معاف کر دیجائے۔ کیوں نہ ہو۔ آخر ہولی نہ آنریری مجسٹریٹ

حضرت رلیشائیل

(۶۰)

لوگوں نے جبرائیل ۔میکائیل ۔ دردائیل ۔عزرائیل ۔ اسرائیل بنو غنکہ نہ جانے کتنے "ایلوں" کے نام سنے ہوں گے ۔ لیکن آج ہم انھیں عالم روحانیت کی ایک "مافوق الادراک" ہستی حضرت رلیشائیل سے روشناس کراتے ہیں۔

لطف یہ ہے کہ حضرت رلیشائیل "جامہ نورانی" سے ملبوس ہونے کے باوجود اپنے دوسرے "ایلی" بھائیوں کی طرح اس دنیا میں نہیں بستے۔ جہاں چڑیا کا دودھ اور گولر کا پھول بکثرت دستیاب ہوتا ہے۔ بلکہ اپنے دھڑتی دھمک، پلنگ توڑ قدوقامت کے ساتھ ہم ایسے خاکی انسانوں کو برابر نظر بھی آتے ہیں۔ آپ نہایت جلیل القدر مؤکل ہیں۔ اور آپ کے روحانی تصرفات سے ناممکنات کے بہت سے کبوتر ممکنات کی کابک میں غٹرغوں کرنے لگتے ہیں۔

دنیا میں کوئی ایسا کام نہیں جو جناب رلیشائیل حسن وخوبی کے ساتھ انجام نہ دے سکتے ہو۔ ان کا قہر وجلال: الہٰی توبہ! مسلمان کو ایک آنکھ میں کافر بنا دیتے ہیں۔ ان کی شان کرم کے کیا کہنے! سبحان اللہ! کافر کو جامع مسجد کے منبر پر جگہ دیتے ہیں۔

اگر خوش قسمتی سے آپ کو کبھی حضرت رلیشائیل سے گفتگو کا موقع ملے تو معلوم ہو گا کہ حضرت ممدوح تمام "ایلوں" کے سرتاج ہیں۔ "بھائی"

جبرائیل تو صرف آپ ہی کے ہاتھ چومنے والوں کو جنت کا مژدہ سناتے ہیں میکائیل کسی مقام پر اُس وقت تک پانی برسا ہی نہیں سکتے جب تک حضرت ربشائیل کی بارگاہِ اقدس سے حکم نہ حاصل کرلیں۔

حضرت اسرافیل صرف اُسی وقت صور قیامت پھونکیں گے جب کوئی خاکی انسان حضرت ربشائیل کی قدرت کاملہ سے "ملحدانہ" انکار کرے۔

رہے میاں عزرائیل ان سے تو جناب ربشائیل کا گہرا یارانہ ہے دن میں سات مرتبہ درِ دولت پر حاضری دیکر پوچھتے ہیں کہ فرمائیے.... ہے کوئی آپ کا مخالف ؟ ابھی مردود کا گلا گھونٹوں۔ حضرت ربشائیل کی زیارت بہت آسان ہے جس وقت آپ شہر کے گلی کوچوں سے گذریں اُس وقت راستہ میں جو ہستی سب سے زیادہ عجیب غریب نظر آئے سمجھ لیجئے کہ بس یہی حضرت والا ہیں۔ کم از کم ساڑھے تین من کی متحرک لاش۔ سر پر اتنا بڑا عمامہ کہ کرۂ ارض کے گرد آسانی سے لپٹ جائے۔ پنڈلی سے اونچا پاجامہ جو اپنے طول میں فٹ بال کھیلنے والوں کے نکر سے صرف چند انچہ بڑا ہوتا ہے۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتہ یا مغربی جیسٹر کوٹ کا منجھلا بھائی کبھی کبھی اس کے اوپر پرانی وضع کی اچکن اور اسکے اوپر واسکٹ کی ہندوستانی بہن صدری۔ "جامہ نورانی" کی جاذبیت کو بڑھانے کیلئے ایک مکلّف عبا بھی پہن لی جاتی ہے۔ یا صحیح معنوں میں شانوں میں اٹکالی جاتی ہے مگر اس کا استعمال "دعوت" و "حاضرات" کے موقعوں پر مخصوص ہوتا ہے۔ داہنے ہاتھ میں ملک لندھور کے گرز کو شرمانے والا ڈنڈا اور بائیں

ہاتھ میں اتنا بڑا رومال جو تمام دنیا کی دولت سمیٹنے کے لئے کافی ہو۔ جسم کے حصۂ اسفل کی آرائش کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا ہے۔ پاؤں میں ہمیشہ دیسی چمڑے کا وہ "شاندار" جوتہ ہوتا ہے جسے کسی مسجد کا عادی چور بھی کبھی ہاتھ نہ لگائے۔ پیشانی پر سیاہ حروف میں مادر گیتی کا یہ نوحہ منقوش ہوتا ہے کہ ع

تو مرا خراب کردی بایں سجدۂ ریائی

حضرت رلیشائیل کے ڈھیلے ڈھالے کرتہ میں ہمیشہ جیبیں بہت ہوتی ہیں لیکن ان میں کرنسی نوٹوں اور کفر کے فتوؤں کے سوا دیسی وضع کا کنگھا ایک مسواک۔ مٹی کے دو تین ڈھیلے استنجے کے لئے اور دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے ہزار دانوں کی تسبیح۔ بہت ممکن ہے کہ جامہ تلاشی پر کوئی جیب کسی مغربی حور کی برہنہ تصویر بھی اگل دے۔

دوسرے تمام ابلیوں کے خلاف حضرت رلیشائیل کی "حاضرات" نہایت آسان ہے۔ اُن کو بلانے کے لئے نہ کسی لمبے چوڑے چلّے کی ضرورت ہے اور نہ کسی قبرستان میں بیٹھکر وظیفہ گھوٹنے کی۔ اصحاب کہف کی دعوت کے سلسلے میں آپ نے سنا ہوگا کہ گلی میں راستہ چلتے ہوئے کسی سیاہ رنگ کے کتّے سے کہہ دیا جائے کہ اے قطمیر فلاں دن فلاں مقام پر اصحاب کہف کے ساتھ تیری دعوت ہے تو تاریخ معینہ پر وہ کتا مع دقیع دعوت پر خود بخود آموجود ہوتا ہے۔ لیکن حضرت رلیشائیل کے لئے تو اسقدر کہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب کبھی آپ اس جلیل القدر ہستی کی زیارت سے مشرف ہونا چاہیں گھر کے باہر

قدر ادیگیں کھنکا دیجیے۔ اور ساتھ ہی میں کسی قدر جو اں بھی ہو تو اور بہتر ہے۔ حضرت ممدوح فوراً زیر لب مسکراہٹ کچھ بڑبڑاتے ہوئے نازل ہو جائیں گے۔

آپ کی تسخیر نہایت آسان ہے۔ جب زیارت نصیب ہو تو اپنے ناتواں ہاتھوں میں حضرت رلیشائیل کے پُرگوشت ہاتھوں کو پکڑ کر اس ذوق و شوق کے ساتھ چوم لیجیے کہ گویا کلید جنت کے مالک یہی ہیں۔ اور اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ جس وقت آپ اُن کے ہاتھوں کو چومنے کے لئے آگے بڑھیں تو اپنے ہاتھ میں چند سنہری روپہلی ٹکلیاں ضرور رکھ لیجیے۔ اور دست بوسی کے بعد فوراً ہی وہ ٹکلیاں ان کے ہاتھوں میں چپ چاپ رکھ دیجیے۔ اس کے بعد ہاتھ جوڑ کر ہم ایسے ڈاڑھی منڈوں کو چند بے نقط سنائیے۔ بس حضرت رلیشائیل مسخر ہو گئے۔ تسخیر کو مکمل کرنے کے لئے پُر تکلف غذاؤں کے چند طباق ان کے سامنے "اللہ میاں کا لیٹر بکس" سمجھ کر رکھ دیجیے۔ اور چند طباق اُن کے گھر بھجوا دیجیے۔

اب حضرت رلیشائیل آپ کے قبضہ میں ہیں۔ جو کام چاہیے ان سے لے لیجیے۔ عمل تو ہم ایسے خاکی انسانوں کے لئے مخصوص ہے۔ حضرت رلیشائیل کی کارگذاریاں صرف زبان کے دائرہ تک محدود رہتی ہیں۔ حضرت خدا ایں واعلیٰ اپنی زبان مبارک کو جنبش دیں گے اور دنیا کی ہر حرام چیز آپ کے لئے فوراً حلال و مباح بن جائے گی۔ اگر بالفرض محال حضرت رلیشائیل نے عمل کی جانب قدم بڑھایا تو جنت کو آپ کے نام ہبہ کر دیں گے۔

جس وقت آپ خدانخواستہ کسی گردش فلکی کا شکار ہوں۔ یا آپ کا

کاروبار تباہ ہو جائے۔ یا آپ کسی سنگین جرم میں ماخوذ ہوں تو حضرت ریشائیل کی صورت آپ کو بارہ بارہ چوبیس کوس بھی نظر نہ آئے گی لیکن حضرت ممدوح رحم دل بہت ہیں۔ اور مُردوں سے حضرت کو خاص محبت ہے۔ اگر خدانخواستہ آپ کے کسی عزیز کا انتقال ہو جائے تو قبرستان سے واپس آنے کے بعد تعزیت کرنے والوں میں یا جانماز کو۔ وہاں کی صورت دینے کے لئے۔ یا پیٹ کے کسی خالی کونے میں حلوے کے دونے کو جگہ دینے کے لئے، آپ کو جن بزرگ کی زیارت سب سے پہلے نصیب ہوگی وہ حضرت ریشائیل ہوں گے۔ اور تشریف رکھنے سے پیشتر ہی بصد ہمدردی بنی نوع انسان دریافت کریں گے کہ مُردہ کا تیجا۔ دسواں۔ بیسواں، چالیسواں کب ہے؟ اور ان نیازوں کے لئے تم نے کیا انتظام کیا ہے؟

جو لوگ حضرت ریشائیل کو مسخر کرنا چاہتے ہیں انھیں یہ امر بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کہ حضرت ممدوح گانے کے بہت شوقین ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ گانا اگر بجانہ ہمسایہ نہیں تو پس پردہ ضرور ہو۔ گانے کا اہتمام خوبصورت عورتوں کے سپرد ہو اور حضرت ریشائیل پڑوس کے مکان میں تنہا ہوں۔ اور دیوار میں کوئی روزن حضرت ممدوح کو شیوۂ اہلِ نظر قائم رکھنے کی اجازت دیدے۔

طوائف

(۶۱)

طوائف! ڈوموں، میراثیوں۔ خوبصورت، تندرست، ہیکڑ، مفلسوں شہرہ پشت گشتہ دل کی کنیز۔ شریفوں اور بلوہداروں کی جان اور مال کی دشمن۔ عیاشوں اور خوشامدیوں کے دل کی ملکہ جس کو دنیا منڈی کہتی ہے

طوائف! گانا سنا کر نوجوانوں۔ جوانوں۔ بڈھوں کو پھنسانے کا ایک پھندہ ہے۔ جس سے گانٹھ کا پورا، آنکھ کا اندھا مشکل ہی سے بچ کر نکلتا ہے۔

طوائف! جس کی سارنگی کے تار سے دل کش آواز تانانت کا تا ملتے ہی نکلتی ہے۔ وہ تار نیک چلنوں کے لئے کچا دھاگا۔ بد چلنوں کے لئے ایسا پھانسی کا پھندہ ہے کہ گلے میں پڑتے ہی آنکھیں اور زبان باہر آ جاتی ہیں۔ اور بغیر آہ کئے دم نکل جاتا ہے۔

طوائف! جس کے طبلہ کی تھاپ میں قارون کا خزانہ بھی دھنس جاتا ہے اس کا طبلہ مفلس چاہنے والوں کو سبق دیتا ہے کہ بھاگ جاؤ۔ جلد ہی سے نکل جاؤ اس مجلس سے۔ ورنہ میری طرح ہمیشہ پیٹے جاؤ گے

طوائف کے سیاہ ہارمونیم کی طرح اس کا دل بھی سیاہ ہے۔ ہارمونیم کے سیاہ و سپید پردے سے نیکی و بدی کے نغمے اُبلتے ہیں۔

مگر ہارمونیم کے سیاہ پردے کے برابر سفید پردہ ہوتا ہے لیکن طوائف کے دل میں نیکی کی سفیدی اتنی کبھی نہیں ہوتی جتنی کالے اڑد پر سفیدی۔

طوائف! جو وقتی خوشی کے لئے جھوٹی ہنسی کے سا تھ حبیب کی آخری نقدی اگلوانے۔ اور ایک وقت میں پوری مجلس کے ہر فرد کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے آرٹ میں، کمال رکھتی ہے۔ احمق عشاق کے جمگھٹ میں ہر فرد اس کی جھوٹی محبت کا اسیر ہوتا ہے۔ حالانکہ اس کو ان میں سے اگر کسی سے محبت ہے تو روپے اور صرف روپے سے، خواہ وہ چاندی کے گول گول گتوں کی صورت میں ہو یا کاغذ کے نوٹوں کی گڈی کی شکل میں کہ وہی اس کا قبلہ حاجات ہے۔

طوائف! ایک خوبصورت ناگن ہے جس کی ایک پھنکار کا زہر امریکہ کے اٹم بم سے زیادہ خوفناک اور تباہ کن ہوتا ہے۔ اٹم بم پوری آبادی کو تباہ کرتا ہے۔ مگر اس زہریلی ناگن کا زہر سینکڑوں آبادیوں۔ خوش حال گھروں کو ویران اور کنگال کر کے ایڑیاں رگڑنے مفلسی اور بے غیرتی سے زندگی تیر کرنے کے لئے چھوڑ دیتی ہے۔

طوائف! ایک ہی وقت میں درجنوں محبّت کرنے والوں کی جیب خالی کرا لیتی ہے اور سب کو یہی یقین دلاتی ہے کہ وہ سب سے محبت کرتی ہے۔ حالانکہ وہ ان سب کو احمق سمجھتی ہے۔

طوائف! جس کی محبت میں عزت کا نیلام، دنیا میں ذلّت و رسوائی عاقبت میں دوزخ، حبس دوام شیطان کی عدالت میں اس کی محبّت کا

مقدمہ جب پیش ہوگا مع خرچہ کے یک طرفہ ڈگری ہوگی۔

طوائف! جس کا دوسرا نام بربادی، معصیت کی سڑی ہوئی لاش ناپاکی۔ بے غیرتی۔ بے حیائی۔ بے شرمی کا گہوارہ۔ جو محبت بھرے دلوں کا قبرستان ہے۔

طوائف! لاوارثی مال۔ گنہ گاروں کی وقف پراپرٹی۔ سرمایہ دار دل کی لاش ... خود دشمنی، خود ستائی۔ خود پرستی کا دوسرا نام ہے۔ جوانی کے لئے ایسا زہر ہے جس کا تریاق نیا میڈیکل سائنس اتنی ترقی کے باوجود ابھی تک تلاش کرنے میں ناکام ہے۔

طوائف! تن کی اجلی۔ من کی میلی، دولت کی پجاری، نفس پرستوں کے جذباتِ شیطانی کی موجوں کے بھنور میں خود بھی ڈوبتی ہے اور اپنے چاہنے والوں کو بھی منجدھار میں ڈبو دیتی ہے۔

طوائف! ماں، بہن بیوی کے مقدس جذبۂ محبت و طاعت سے خالی ہوتی ہے۔ وہ لذت اور عیش میں گم رہنا چاہتی ہے اور ایثار و قربانی سے نا آشنا۔

طوائف! ایک ایسی مچھلی ہے جو شکاری کے جال میں مشکل سے پھنستی ہے لیکن جب پھنستی ہے تو اندھی بن کر۔ تمام عمر کا اندوختہ جو ہزار دل گھر دں کی بربادی سے جمع ہوا تھا جھوٹی محبت کے نام پر اداکاری کرنیوالے اس مرد کے قدموں میں ڈال دیتی ہے جو اسکو اسیر کرنے اور اس کا مال کھانے کے آرٹ سے واقف ہو اور یہ بھول جاتی ہے کہ جس طرح اس نے روپیہ حاصل کرنیکے لئے جھوٹی محبت کی ہے اس سے بھی روپیہ حاصل کرنے کیلئے قدرت جھوٹی محبت کرنیوالوں کو اس پر مسلط کر دیتی ہے۔

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

ایکٹریس!

(۶۲)

ایکٹریس! بناسپتی گھی کی ورق لگی چیپیدہ مٹھائی جس کو احمق نوجوان اصلی گھی کی مٹھائی سمجھتے ہیں۔ اور یہ وہ مٹھائی ہے جو فلمی دُنیا کے دستر خوان کی زینت ہے۔

ایکٹریس! طوائف کا ترقی یافتہ ماڈل۔ اور رنڈی کی نگیٹو پلیٹ۔ جو سنیما کے کمرہ میں چھپ کر اسکرین پر اپنے مصنوعی حُسن سے فلم بینوں کے دلوں پر عرصہ تک حکومت کرتی ہے۔

ایکٹریس! ایک ایسی زہر کی بوتل ہے جس پر شربت انگور کا لیبل لگا دیا گیا ہے۔ ایسا دیسی ٹھرا جو سکاچ وہسکی کی بوتل میں چار سو بیس کے لئے بھرا گیا اور اس کو پینے والا اس وقت ہوش میں آتا ہے جب اس کی جیب کی آخری پونجی بھی صرف کرادی جاتی ہے۔

ایکٹریس! جس کا حُسن اور خوبصورتی لیف پاوڈر اور کیمرہ مین کے اُنگل کا رہینِ منت ہے۔ جس کی چمک دمک سے فلمی دنیا مسحور ہو جاتی ہے ایک ایسی زہریلی ناگن ہے جس کے کاٹنے کے بعد انسان پانی نہیں مانگتا مگر خود پانی پانی ہو جاتا ہے۔

ایکٹریس! ایک ایسی خوبصورت بلا ہے جس کو دیکھکر زاہدِ خشک کے منھ میں بھی پانی بھر آتا ہے۔ اور جس کا عہدِ حکومت بچّہ سقّہ سے کچھ زیادہ طویل نہیں ہوتا۔

ایکٹریس! ایک ایسا چلتا پھرتا جادو ہے جس کی نگاہ فتنہ ساز سے او ہوسنت اور صوفی منش انسان، زاہد تقویٰ شعار باوجود کوشش کے بھی نہیں بچ سکتا۔ اور جس کی نگہِ نیم باز اور پازیب کی ایک ہلکی سی جھنکار میں ہزاروں قیامتیں برپا ہو جاتی ہیں۔ لاکھوں نوجوان اس کی ہلکی سی مسکراہٹ پر نقدِ دل پیش کرتے ہیں۔

ایکٹریس! جس کی شہرت کا راز ڈائرکٹر کی نفس پرستی۔ پروڈیوسر کی ہوس پرستی پبلسٹی افسر اور ایڈیٹر کی خوشنودی، کیمرہ مین کی پذیرائی میں مضمر ہے

ایکٹریس! ایک گڑیا ہے جس کے فریب سے دودھ پیتے بچے سے لیکر نوجوان بڈھا حتیٰ کہ پیر نابالغ بھی نہیں بچ سکتا۔

ایکٹریس! ایک ایسی ڈائن ہے جو ہزاروں نوجوانوں کے دلوں کا ہار گلے میں ڈالتی ہے۔ سینکڑوں محبت کرنے والوں کا خون چوسنے پر بھی اس کی پیاس نہیں بجھتی۔ ہزاروں آباد اور خوش حال گھروں کو ویران کرنے کے بعد بھی اس کا گھر آباد نہیں ہوتا۔

ایکٹریس! ایک ایسی چڑیل ہے جو رات کی گنہ آلود نیند سے ۱۲ بجے دن کو بیدار ہوتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھنڈر پر اُلّو بیٹھا ہوا ہے۔ یا پُرانی قبر پر بجّو جس کے اصلی خد و خال انگوٹھا چوسنے والا بچہ بھی دیکھ لے تو

خوف زدہ ہو کر ماں کی چھاتی سے لپٹ جائے۔ اور بے اختیار اس بلی چا سے ڈر جائے۔

ایکٹریس! پبلک پراپرٹی ہے۔ جس سے لطف اندوز ہونا چونی والا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ اس کے مصنوعی حسن۔ اس کی دل کش ادا کاری کو ہر تانگہ اور چھلّی والا اپنے اور صرف اپنے لئے وقف سمجھتا ہے۔

ایکٹریس! غیرت دار خاوند۔ باپ، بھائی بیٹے کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔ جو خاندان کا نام روشن کرنے کے لئے ناموس کا سودا کر کے خود بھی شہرت کی انتہائی منزلیں طے کرتی ہے۔ اور اپنے رشتہ داروں کو بھی شہرت اور دولت دلواتی ہے۔

ایکٹریس! ایک ایسا جاندار کھلونا ہے جس سے اس کے چاہنے والے دل بہلاتے ہیں۔ لیکن وہ پورے مجمع عشاق کے دلوں سے کھیلتی ہے۔ اور اکثر ایک کو دوسرے کے خلاف استعمال کرنا اپنا فطری حق سمجھتی ہے۔

ایکٹریس! جس محفل میں نہ ہو وہ سونی۔ جس مجلس میں ہو اس کی زینت جس خاندان میں ہو اس کے لئے لکشمی کی دیوی جس کی پوجا بڑھاپے تک رہتی ہے۔

ایکٹریس! سماج کے جسم پر کوڑھ۔ سوسائٹی کے بدن پر ناسور جسکو محبت کے پیاسے سبیل کا مٹکا سمجھتے ہیں۔

ایکٹریس! اداکاری کا ماڈل۔ فریب کاری کا مجسمہ۔ دغا بازی اس کی فطرت۔ بے حیائی اس کی طینت۔ زرکشی اس کا پیدائشی حق بیتیوں

صدی کا سب سے بڑا فراڈ۔

ایکٹریس! مغربی تہذیب کی پیداوار۔ جدید تعلیم کا ناجائز حمل۔ آبرو باختہ گڑیا۔ جو شریف خاندان میں پیدا ہوکر اس خاندان کے لئے لعنت۔ ننگِ انسانیت۔ اور شرافت، انسانیت، حیا، عصمت، گنہ کے بازار میں فروخت کرکے مغرب زدہ تتلیوں کے لئے مجسم درسِ عبرت ہے۔ لیکن کتنے ہیں جو اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔